اقبال کا آخری معرکہ

مرتبہ
سید نور محمد قادری

ضیاء القرآن پبلی کیشنز ۰ گنج بخش روڈ ۰ لاہور

بہ خدمت جناب مولانا محمد شفیع صاحب رضوی استقلال
گیرد۔ مولانا صاحب یکے از مخلصانِ حضرت اقبال اند
سید نور محمد قادری
۱۶ فروری ۱۹۸۷ء

اقبال کا آخری معرکہ

مُرتبہ
سید نور محمد قادری

ضیاء القرآن پبلی کیشنز ○ گنج بخش روڈ ○ لاہور

نام کتاب ـــــ اقبال کا آخری معرکہ
مرتبہ ـــــ سید نور محمد قادری
بار ـــــ دوم، ترمیم و اضافہ شدہ اڈیشن
تاریخ اشاعت ـــــ جنوری ۱۹۸۷ء
قیمت ـــــ -/۳۰ روپے
ناشر ـــــ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ
لاہور ۲ فون ۶۳۴۶۴

انتساب

برادرانِ گرامی قدر سید گلزار محمد قادری اور سید خلیل احمد بی۔ اے قادری کی خدمت میں یہ اوراق منسوب کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

سید نور محمد قادری

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

جو جانتا نہیں جینا وہ جانے کیا مرنا
حرم سے ٹوٹ کے دشوار ہے بسر کرنا
جہاں میں ہر کہیں رہنا عرب کا دم بھرنا
عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
حدود ہند و سمرقند و چیں میں ہے پابست
بے فکرِ جامِ شرابِ گشت سے سرمست
حرم کو چھوڑ کے بتخانے سے ہو پیوست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
روا نہیں ہے تمیزِ جمال و صورت و پوست
جہاں میں متحد اک لا الٰہ سے ہیں سب دوست
متاعِ فخر نہ دہلی نہ اصفہاں نہ خوست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

نظیر لدھیانوی

فہرست مضامین

دیباچہ طبع ثانی

مولوی حسین احمد دیوبندی کا نعرہ ،، ملت از وطن است ،، اور حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی للکار ،، این ہمہ بولہبی ست ،، محض دو افراد کی رائے کا نہیں، بلکہ دو متضاد نظریوں کا اختلاف تھا۔ ایک نظریہ باطل کا ترجمان اور دوسرا حق کی آواز تھا۔ ایک فلسفہ گاندھی کی بازگشت اور دوسرا تعلیماتِ محمدی کا آئینہ تھا۔

پھر نیرنگیٔ زمانہ دیکھئے کہ حق کا ترجمان ایک جدید تعلیم یافتہ (سید سلیمان ندوی کی زبان میں مغرب زدہ) تھا اور باطل کی پشت پناہ ایک روایتی عالم دین جو ،، ز خاکِ مکہ ابوجہل ،، کی صداقت پر گواہی دے رہا تھا۔

اس معرکۂ حق و باطل کی داستان دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ اسی داستان کو اس کتاب میں پیش کرنا مقصود ہے۔

پہلا ایڈیشن بڑی افراتفری اور عجلت میں بغیر کسی پروگرام کے ترتیب دیا گیا یہاں تک کہ دیباچہ تک لکھنے کی نوبت تک نہ آسکی۔ لیکن پھر بھی حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے شیدائیوں نے اس ناقص ایڈیشن کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور تین چار ماہ کے مختصر سے عرصہ میں ناشر کے پاس ایک کاپی بھی نہ رہی۔

اب زیر نظر ایڈیشن نئی ترتیب اور نئی معلومات کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلا ایڈیشن ماہنامہ ،، الرشید ،، کے ،، اقبال و مدنی نمبر ،، کی اشاعت سے پہلے ترتیب پا چکا تھا۔

اس لیئے اس نمبر کی خرافات کے بارے میں میری طرف سے کچھ نہ لکھا جا سکا۔ لیکن بھلا ہو جناب محمود میاں تومی صاحب کا کہ انہوں نے اپنے انداز میں اس کمی کو کسی حد تک ،، تقریب ،، میں پورا کر دیا۔ اب اس نمبر کی خرافات پر محاکمہ و تبصرہ کے لیئے ایک علاحدہ باب مختص کر دیا گیا ہے۔

آخر میں اپنے حبیبِ مکرم جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انہوں نے نہ صرف معتدبہ مواد مہیا کیا۔ بلکہ حوالہ کی بیشتر کتب بھی بہم پہنچائیں۔ حکیم صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے۔ جن کے متعلق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ ،، دیدہ ور ،، علمی اور دینی دنیا کی جو بے لوث خدمات سرانجام دے رہا ہے اسے تاریخ مدتوں تک یاد رکھے گی۔ اس ایڈیشن میں یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ کہ جہاں تک ہو سکے اصل کتابوں کے حوالے پیش کیئے جائیں۔ چنانچہ بڑی کوشش سے مکتوبات شیخ الاسلام ہر سہ حصص مطبوعہ دیوبند اور دیگر کتب حاصل کی گئی ہیں۔

یکم نومبر ۱۹۸۰ء

سید نور محمد قادری

چک ۱۵ شمالی، گجرات، ڈاکخانہ چک ۵

میں ممنون ہوں

۱۔ میں ممنون ہوں جناب جسٹس جاوید اقبال صاحب دام ظلہ کا جنہوں نے بکمال عنایت کتاب کے لیئے تعارف لکھا۔ وہ ماشاء اللہ ایک درد مند مسلمان ہیں۔

۲۔ حبیب مکرم گرامی قدر جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری صدر مرکزی مجلس رضا کا جنہوں نے کتاب کی "تقدیم" کے لیئے وقت نکالا۔ حکیم صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے۔ جن کے متعلق حضرت علامہ فرما گئے ہیں۔ ؎

در کعبہ و بت خانہ مے نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

۳۔ میاں محمد زبیر صاحب سلمہ ربہٗ کا جنہوں نے اس کساد بازاری کے دور میں کتاب کو ہر لحاظ سے معیاری طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔

سید نور محمد قادری

تعارف جسٹس جاوید اقبال

سید نور محمد قادری کی یہ تصنیف اضافہ کے ساتھ دوسری بار شائع ہو رہی ہے موضوع اس کا قوم و ملت کی توضیح کے سلسلہ میں علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان بحث ہے۔ جسے علامہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں خاصی اہمیت حاصل ہوئی تھی۔

قوم و ملت کو ایک تصور کرتے ہوئے علامہ اقبال کا موقف یہ تھا۔ کہ قومیت اسلام مقام کی پابند نہیں۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی قوم و ملت کے معانی میں امتیاز کرتے تھے۔ اور ان کے نزدیک گو قوم علاقہ کی پابند تھی۔ ملت اس سے آزاد تھی۔

عام طور پر مشہور ہے۔ کہ بحث کے آخری مرحلہ میں مولانا حسین احمد مدنی نے علامہ اقبال کی "غلط فہمی" کو یہ بیان دے کر دور کر دیا تھا۔ کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو ہندوستان میں قومیتِ متحدہ یعنی وطنیت کے مغربی تصور کو قبول کر لینے کا مشورہ کبھی نہیں دیا اور ان کے موقف کو غلط سمجھا گیا ہے۔ اس پر علامہ اقبال نے تحریر کیا تھا کہ ایسی صورت میں انہیں مولانا حسین احمد مدنی پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔

سید نور محمد قادری کی تحقیق کے مطابق مولانا حسین مدنی ہمیشہ قومیتِ متحدہ کے مبلغ اور ترجمان رہے اور علامہ اقبال کی وفات کے بعد بھی اپنا موقف اپنے مضمون "متحدہ قومیت اور اسلام" میں اسی شد و مد کے ساتھ پیش کیا۔ نیز علامہ اقبال کے متعلق تحریر فرمایا۔ کہ وہ اپنی غیر معمولی قابلیت کے باوجود برطانیہ کے سحر میں مبتلا تھے۔ علامہ اقبال ان کو جواب دینے

کے لیے تو زندہ نہ رہے لیکن اس معاملہ میں ارمغانِ حجاز میں ان کا قطعہ بجائے خود ایک مستقل جواب ہے۔

بہرحال قیامِ پاکستان کے بعد اس بحث کو علمی اور تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اور سید نور محمد قادری نے اس موضوع پر یہ کتاب لکھ کر اقبالیاتی ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

جاوید اقبال

پہلا باب

اقبال

اسلامی قومیّت کا ترجمان

باب اوّل

اقبال اور اسلامی قومیت کا ترجمان

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمان قوم کی اپنے نئے حاکموں اور سابق محکوموں کی ملی بھگت سے جو درگت بنی اس کا نقشہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے یوں کھینچا ہے۔

"۱۸۵۷ء کا ہنگامہ مسلمانوں کے حق میں قیامت کا سا ہنگامہ تھا۔ ان کا قومی شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ایک طرف وہ ملک کے آقاؤں کی نظر میں مردود دوسری طرف برادرانِ وطن نے نئی قوت اور آزادی کے زعم میں کچھ نئے آقاؤں کی شہ پا کر ان سے انتقام لینا اور کھلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر طرف سے راندہ اور درماندہ تھے۔ ایک یاس کا عالم تھا۔ ان دو عیار قوموں سے ایسی بے بسی کی حالت میں مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی وہ سمجھ چکے تھے کہ اب اس ملک میں عزت و آبرو سے رہنا ناممکن ہے معیشت کے سب دروازے اُن پر بند تھے۔"[1]

اُدھر مسلمانوں کی یہ حالت تھی۔ ادھر عیار ہندو "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"

[1] سر سید احمد خاں اور ان کا تفکر از رحمت فرخ آبادی "العلم" کراچی مارچ ۱۹۷۲ء ص ۶۲، ۶۳۔

کی پالیسی پر عمل کر رہا تھا۔ نئے حکمرانوں کی زبان اور یورپ کے نئے نئے علوم و فنون کی تحصیل کر کے ملک کی کلیدی اسامیوں میں نئے آقاؤں کے ساتھ شریک کار ہو رہا تھا۔ لیکن مسلمان ایک تو "پدرم سلطان بود" کے غلط زعم میں مبتلا تھا اور دوسرے اس کے کئی بر خود غلط مذہبی رہنماؤں[1] نے انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل کو ناجائز اور حرام قرار دے دیا تھا۔ اسی طرح مسلمان سیاسی اور معاشی میدان میں اپنے برادرانِ وطن سے بہت پیچھے جا رہا تھا۔ عیار ہندو اپنے روایتی تعصب کی وجہ سے ہر ایسے امر کے مزاحم ہو رہا تھا۔ جو اسے مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلاتا۔

انڈین نیشنل کانگرس کا قیام

مسلمانوں کے برعکس ہندو، یورپی علوم و فنون کی تحصیل کر کے اعلیٰ ملازمتیں حاصل کر رہے تھے۔ تجارت پر پہلے ہی وہ چھائے ہوئے تھے۔ اب اُنہوں نے سیاسی طور پر اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے ایک انگریز مسٹر ہیوم کی مدد سے ایک سیاسی پارٹی "انڈین نیشنل کانگرس" قائم کی جس کے پیش نظر صرف "ہندی قومیت" کا احیاء تھا۔ ڈاکٹر سیتارام مصنف "ہسٹری آف کانگرس" لکھتے ہیں:-

"یہ تمام تحریکیں (برہمو سماج اور آریہ سماج وغیرہ) درحقیقت ہندوستانی قومیت کی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں اور اب قوم کا فریضہ تھا کہ ایک جامع چیز پیدا کی جائے اور قدیم مذہب یعنی ویدانتی تصوف

[1] ان سیاسی علماء کی ذہنی رسائی کی یہ ادنیٰ سی مثال ہے کہ ۱۹۲۷ء میں پشاور کے ایک جلسہ میں جب پہلی بار مائیکروفون استعمال کیا گیا تو مشہور کانگرسی عالم مفتی کفایت اللہ صاحب نے اسے شیطان کی آواز کہہ کر اس کے استعمال کو شرعاً ناجائز سمجھا۔ (سرحد کی جدوجہد آزادی۔ تالیف اللہ بخش یوسفی مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء ص ۴۴۹)

کا احیا کر کے اسے عہد جدید کی قومیت سے مطابقت دے کر چلایا جائے اور انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعہ اس مقصد کا پورا کرنا مقصود تھا۔"[2]

پنڈت موتی لال نہرو کا بیان ہے:۔

"خود کانگریس ایک ہندو جماعت ہے اس میں ۲۱-۱۹۲۰ء میں تھوڑے سے مسلمان شامل ہو گئے تھے۔ ورنہ ابتدا ہی سے یہ ہندو جماعت ہے"[3]

مسلم لیگ کا قیام

ان حالات میں مسلمان رہنماؤں پر لازم ہو گیا تھا کہ وہ ایک طرف تو مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت سے باز رکھیں اور دوسری طرف ایک ایسی نئی سیاسی پارٹی قائم کرنے کی کوشش کریں جو مسلمانوں کے ملی تشخص کو ابھارنے اور قائم رکھنے میں ممد ہو۔ چنانچہ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے مسلمان قوم کو کانگریس میں شامل ہونے کے مضمرات سے آگاہ کرنے کے لیئے زبان اور قلم دونوں سے کام لینا شروع کر دیا۔ مشہور صاحب قلم مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک دفعہ "ہندو مسلم فساد" کے موقع پر اپنے ہفت روزہ پرچے "مہذب" لکھنؤ میں یہاں تک لکھ دیا۔

"حالات کچھ ایسے ہی ہیں کہ کوئی قوم دوسرے فرقے کے جذبات کو مجروح کیئے بغیر مذہبی رسوم ادا نہیں کر سکتی۔ نہ ہی عوام میں رواداری اور صبر کا اتنا مادہ ہے کہ دوسروں کی توہین کو معاف کر سکیں۔

[2] "العلم" کراچی مارچ ۱۹۶۲ء ص ۶۲۔ سرسید احمد خاں اور ان کا تفکر از رحمت فرخ آبادی۔

[3] "شیر پنجاب" لاہور ۱۹ ستمبر ۱۹۲۶ء بحوالہ العلم کراچی مارچ ۱۹۶۲ء ص ۶۵۔

اگر حالات اس حد تک پہنچ چکے ہیں تو پھر دانشمندی یہی ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور آبادی کا تبادلہ کر دیا جائے۔"[4]

اسی طرح مولانا عبدالحلیم شرر پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے تقسیم ہند اور تبادلہ آبادی کی تجویز پیش کی۔ سرسید احمد خاں تو ۱۸۹۸ء میں فوت ہو گئے۔ لیکن ان کی وفات کے صرف آٹھ سال بعد چند دردمند مسلمان رہنماؤں کی کوشش اور ہمت سے مسلمانوں کی اپنی الگ جماعت "مسلم لیگ" قائم ہوگی جس نے مسلمان قوم پر بڑا دوررس اثر ڈالا اور بے دردیٔ زمانہ سے پسی ہوئی قوم انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی اور صرف چالیس سال کی جدوجہد کے ثمرہ میں ایک ایسی مملکت کی بانی بنی جو صرف مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی دنیا کی پہلی مملکت تھی۔

علامہ اقبال کی وطن پرستی کا دور

شروع شروع میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ بھی کانگریس سے متاثر تھے متحدہ قومیت یعنی نسلی اور جغرافی بنیادوں پر ایک قوم ہونے کے حامی تھے۔ اس دور کی نظموں میں انہوں نے اس نظریہ کو بہت واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر مندرجہ ذیل نظمیں ان کے اس نظریہ کی بہترین ترجمان ہیں:۔

۱۔ ہمالہ
۲۔ نیا شوالہ
۳۔ ہندوستانی بچوں کا گیت
۴۔ ترانۂ ہندی

[4] "نقوش" لاہور۔ اقبال نمبر شمارہ ۱۲۱۔

۵۔ صدائے درد

۶۔ تصویر درد

نیا شوالہ کی نظم کے مطالعہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے دل و دماغ پر اکبر کے تخلیق کردہ "دین الٰہی" اور بھگتی تحریک کے گہرے اثرات تھے۔ چنانچہ ذیل میں ہم یہ پوری نظم اور اس نظم پر جناب محمد احمد خاں کا تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ تاکہ اس دَور کے اقبال کے ملی و سیاسی فکر کی مکمل اور واضح تصویر قارئین کے سامنے آجائے۔

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تُو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدال سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مُورتوں میں سمجھا ہے تو خُدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے۔ لہٰذا کیوں کر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسی اصول مثلاً وطن پرستی پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے۔ قومیت کا ملکی تصور جس پر زمانۂ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں، اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قومیت کے جدید تصور نے چھوٹے چھوٹے پولٹیکل حلقے قائم کرکے اور ان میں رقابت کے اس صحیح القوام عنصر کو پھیلا کر دنیا کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچایا ہے۔ لیکن بڑی خرابی اس تصور میں یہ ہے کہ اس میں غلو اور افراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس نے پولٹیکل شازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس نے فنون لطیفہ و علوم ادبیہ کو خاص خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث دے کر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرح ایک مادی شئے کا تالیہ ہے جو سراسر اصول اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لیئے نمودار ہوا تھا۔ لیکن اس سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ میں جذبۂ حب وطن کا سرے سے مخالف ہوں۔ ان قوموں کے لیئے جن کا اتحاد حدود ارضی پر مبنی ہو۔ اس جذبے سے متاثر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے لیکن میں ان لوگوں کے طرزِ عمل کا یقیناً مخالف ہوں۔ جو اس امر کے معترف

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا، ستم اٹھانا اور اُن کو پیار کرنا۵؎

محمد احمد کا تبصرہ و تجزیہ

آپ نے دیکھا اس نئے شوالہ کا صنم کون ہے جس کو پوجنے کی شاعر تلقین کر رہا ہے۔ "ہندوستان"۔ تعجب کیوں ہو جبکہ شاعر نے پہلے ہی بند کے آخری شعر میں یہ برملا کہہ دیا ہے۔ کہ

ع خاکِ وطن کا ہر ذرّہ مجھ کو دیوتا ہے

اقبال اس زمانہ میں ایک نیا شوالہ بنا رہا ہے اور اس میں اپنے حسنِ تخیل کی تراشی ہوئی موہنی مُورتی ہندوستان کو نصب کر کے اس کی سندرتا میں خود کھو جانا اور دیس کے رہنے والوں کو پیت کی مے پلا کر اس مورتی کے قدموں پر لا ڈالنا چاہتا ہے۔ ابھی تو وہ آذری کر رہا ہے۔ ابراہیمی دَور ابھی دُور ہے۔

اقبال کو اس زمانے میں ہندوستانیوں کے باہمی اختلاف و افتراق کا شدید احساس ہے اور اس احساس کی بنیاد پر اس نے "نیا شوالہ" کی تعمیر کی ہے لیکن اس اختلاف و افتراق کی نوعیت اس کی نظر میں محض مذہبی ہے۔ یہ لڑائی صرف شیخ و برہمن کی باہمی چپقلش ہے۔ اس لیئے وہ "واعظ کے خدا" اور "برہمن کے بُت" دونوں سے بیزار ہے۔ اس اختلاف اور غیریت کے مٹانے کے لیے وہ ہندو

۵؎ کلیاتِ اقبال مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۲۴؁ء ص ۵۰، ۵۱۔ بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ تالیف محمد احمد خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷؁ء ص ۱۷، ۱۸۰۔ بانگِ درا میں اس نظم کے صرف نو اشعار درج ہیں اور مقطع بالکل بدلا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ے شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

کے "دیر" کو چھوڑ دینا اور مسلمان کے "حرم" کو خیرباد کہہ دینا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ہندو اور مسلمان سے متنفر نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی دیس کے باسی ہیں۔ اسی لیئے ان دونوں کی بہترین روایات کو ایک ہی تہذیب میں سمو دینا چاہتا ہے۔ وہ گلے میں زنّار پہنے، تسبیح ہاتھ میں لینا اور ناقوس کو آوازۂ اذان میں چھپا دینا چاہتا ہے۔ اقبال کے یہ خیالات کبیر کی تحریک اور اکبر کے دینِ الٰہی سے کس قدر زیادہ قریب ہیں۔ اکبر نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ ہندو کے دھرم اور مسلمان کے مذہب کو ختم کر کے نیا دین جاری کیا جائے۔ کبیر بھی مذہبی اختلاف کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی تحریک اتحاد کا مرکز جوگ ہے۔ اقبال بھی اکبر و کبیر کی مانند دھرموں کے بکھیڑوں کو پیت کی گنگا میں جلا کر بھسم کر ڈالنا چاہتا ہے اور متحدہ قومیت کی تعمیر وطن کی محسوس بنیاد پر کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے باہمی پریم محبت اتفاق و اتحاد کا فارمولا اس کے پاس یہ ہے کہ ہندو مسلمان دونوں ایک ہی صنم کے پجاری بن جائیں اور یہ صنم سوائے ہندوستان کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ گویا

مذہب وجہ اختلاف ہے اور وطن مرکزِ اتحاد۔۶؎

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس دور کی کہی ہوئی نظموں میں سے ایک نظم "ترانۂ ہندی"، مسٹر گاندھی کو بہت زیادہ محبوب تھی۔ اس کا اظہار انہوں نے جوہر دہلی کے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں یوں کہا ہے۔

"آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں۔ لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں۔ کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا" (ترانۂ ہندی) پڑھی تو میرا دل بھر آیا۔ جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے

۶؎ اقبال کا سیاسی کارنامہ تالیف محمد احمد خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷؁ء ص ۱۹، ۲۰۔

اس نظم کو گایا ہو گا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں، تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"[57]

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں۔ کہ اس دور میں وہ متحدہ قومیت پر اعتقاد رکھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"ابتدا میں (NATIONALISM) بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔"[58]

متحدہ قومیت سے مسلم قومیت کی طرف

جیسا کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ شروع شروع میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نظریۂ وطنیت کے نہ صرف حامی تھے۔ بلکہ زبردست مبلغ بھی تھے لیکن جب اردو، ہندی اور ذبیحہ گاؤ کے آئے دن کے جھگڑوں میں ہندو ذہنیت پوری طرح سے بے نقاب ہو گئی اور پھر تقسیم بنگال کے موقع پر جو محض انتظامی سہولتوں کے پیش نظر عمل میں لائی گئی تھی۔ کانگرس کا مسلم دشمن رویہ کھل کر سامنے آ گیا تو حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ میں بھی تبدیلی ہونے لگی۔

اسی زمانہ میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ تشریف لے گئے اور اپنی آنکھوں سے فرنگی نظریۂ وطنیت کے بھیانک و مذموم عزائم و اثرات کا مطالعہ کیا تو اس سے کلیۃً متنفر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جب ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے ملی تشخص اور جداگانہ نیابت کے

---

[57] وہی ص ۲۴

[58] روزنامہ جنگ کراچی ۱۰، اپریل ۱۹۶۷ء اقبال کا خط بنام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

اصولوں کی بنیاد پر "مسلم لیگ" قائم ہوئی۔ تو وہ دوران تعلیم ہی مسلم لیگ کی لندن شاخ کی مجلس عاملہ کے رکن بن گئے۔ سرگذشت اقبال کے مصنف کا بیان ہے:۔

"اقبال کے قیام یورپ کے دوران ہی میں آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی۔ مئی ۱۹۰۸ء میں کیکسٹن ہال میں سید امیر علی کی صدارت میں لندن میں مقیم مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برطانوی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سید امیر علی صدر چنے گئے۔ اور علامہ اقبال کو مجلس عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ بلکہ قواعد و ضوابط کی ترتیب کے لیے جو کمیٹی مقرر ہوئی۔ اس میں بھی سید امیر علی اور سید حسن بلگرامی کے ساتھ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔"[59]

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک اصول کرکے ۱۹۰۸ء میں عملی سیاست میں داخل ہوئے اور اپنی تیس سالہ سیاسی زندگی میں اس اصول پر سختی سے کاربند رہے اور ایک دن کے لیے بھی اپنے موقف سے سر مو پیچھے نہ ہٹے۔ حالانکہ دوسرے بڑے بڑے مسلمان لیڈروں مثلاً حضرت قائد اعظم آغا خاں راجہ محمود آباد، مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، ابوالکلام آزاد اور سر عبدالقادر وغیرہم کی سیاسی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔

حضرت علامہ نے تحریک ترک موالات، نہرو رپورٹ اور سائمن کمشن کے زمانہ میں اپنے دوستوں کی دشمنی مول لے لی لیکن مسلمانوں کی ملی انفرادیت اور جداگانہ نیابت کے اصولوں کو دھکا نہ لگنے دیا۔

وطنیت کیا ہے؟

آگے جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھ

---

[59] سرگذشت اقبال مرتبہ عبدالسلام خورشید مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء ص ۶۰۔

لیا جائے۔ کہ سیاسی زبان میں "وطنیت" کے کیا معنی ہیں۔ تاکہ آئندہ اوراق کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ محمد احمد خاں صاحب "وطنیت" کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:۔

"انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا، جس فضا میں نشو و نما پاتا اور جس سرزمین پر وہ رہتا بستا ہے۔ اس سے اس کو ایک گونہ محبت ہو جاتی ہے اور یہ ایک فطری لازمہ ہے۔ یہ ہے وطن اور اس کی محبت کا فطری تصور۔ لیکن سیاسی زبان میں وطن سے مراد یہ نہیں ہے بلکہ وطن سے مراد وطنیت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وطن ایک مرکز اتحاد ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے جو اس میں بستے ہیں۔ وطن کا یہ تصور ان تمام انسانوں کو جو ایک مخصوص جغرافی خطہ میں بستے ہیں۔ ایک منظم جماعت قرار دیتا ہے۔ جن کا باہمی مفاد ایک ہے۔ جن کی زندگی کا نصب العین ایک ہے اور جن کا لائحہ عمل ایک ہے۔ اس طرح روئے زمین کے تمام انسان مختلف مخصوص جغرافی خطوں میں تقسیم ہو کر مختلف قومیتیں بناتے ہیں۔ لیکن مختلف قومیتوں میں ہم آہنگی کی بجائے تضاد پایا جاتا ہے۔ پھر یہ تضاد ان کو باہمی مسابقت۔ مقابلہ اور بالآخر منافرت تک لے جاتا ہے۔ سیاسی زبان میں جب وطن کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے مضمرات یہی ہوتے ہیں اور یہی وطنیت اسلام سے ٹکراتی ہے۔ لیکن وطن اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں ہے"۔[10]

جناب پروفیسر ابوالخیر کشفی صاحب فرماتے ہیں:۔

---

[10] اقبال کا سیاسی کارنامہ از محمد احمد خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۲۶، ۲۹۔

"پاکستان کا تصور قومیت اسلام سے عبارت تھا اور علمائے دیوبند نے ہندی قومیت کا پیوند وطن کے ساتھ لگایا۔ ان حضرات نے اس پر غور نہیں کیا کہ وطن ایک سیاسی نظریہ بن چکا تھا اور محض حب وطن تک محدود نہ تھا۔ پھر وطنیت اپنی تنگی کی بنا پر اسلام کی ضد تھی۔ اس مسئلہ پر اقبال اور مولانا حسین احمد کی باہمی بحث سے تو ہم سب واقف ہیں۔ اور پھر اقبال کے وہ مشہور شعر

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است الخ

حقیقت وہ تھی جو اقبال بیان کر رہے تھے اور جسے مسلم قوم نے قائد اعظم کی قیادت میں اپنی منزل قرار دے لیا تھا اور علمائے عصر کی ایک جماعت اصطلاحی مباحث میں مبتلا تھی۔ اقبال نے ۱۹۰۸ء کے بعد ہی اپنی نظم "وطنیت" میں اس مسئلہ کو جس طرح پیش کر دیا تھا۔ وہ ۱۹۴۰ء میں اور آج بھی حرف تازہ کا درجہ رکھتا ہے کیوں کہ اس دلیل کی بنیاد وہ آفاقیت ہے جو وقت پر خندہ زن ہے"۔[11]

خود حضرت علامہ رحمۃ اللہ وطنیت اور ملت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموس وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا

---

[11] "نقوش" لاہور ۱۲۳۔ اقبال کے ساتھ ساتھ از ابوالخیر کشفی ص ۲۸۲۔

ہے. جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کے بنیادی اصول ہونے کا دعوٰے کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے. کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔" [۱۲]

اقبال کی نظم "وطنیت"

"وطنیت" اس موضوع پر صرف پہلی ہی نہیں، بلکہ ایک جامع ترین نظم ہے. اس کے بعد حضرت علامہ نے جو کچھ اس موضوع پر کہا ہے وہ اسی نظم کی تفسیر و تشریح ہے. اس کی اہمیت و افادیت کو دیکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے. کہ اسے مکمل شکل میں قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے.

ملاحظہ ہو. ـــ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

[۱۲] مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۷۶ ، بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ تالیف محمد احمد خاں ص ۴۸ ، ۴۹۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اسی سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے

(بانگِ درا)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں. کہ "وطنیت" یا اسی قبیل کی دیگر نظمیں لکھنے کے بعد حضرت علامہ کا دل جذبہ حبِ وطن سے خالی ہو گیا تھا. یہ جذبہ آخری وقت تک ان کے دل کو گرماتا رہا اور ان کے آخری دور کی نظموں میں بھی اس موضوع پر بہترین اشعار ملتے ہیں. ہاں اسلامی علوم کے وسیع مطالعہ اور اپنے تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر وہ جدید وطنیت کے شدید مخالف ہو گئے تھے اور عمر بھر اس کے خلاف جہاد کرتے رہے.

یورپ سے واپسی کے بعد پنجاب مسلم لیگ میں شمولیت

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے. کہ حضرت علامہ دورانِ تعلیم ہی مسلم لیگ کی لندن شاخ کے ممبر بن چکے تھے. اس لیے یورپ سے واپسی کے بعد پنجاب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے. حضرت علامہ کے ایک مخلص دوست جناب مرزا جلال الدین بیرسٹر صاحب کا بیان ہے:-

"تعلیم سے فارغ ہو کر جب وطن واپس آئے تو صوبائی

مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اس کے صدر مولوی شاہ دین مرحوم
تھے۔ مسٹر محمد شفیع سیکرٹری تھے اور میں اسسٹنٹ سیکرٹری۔ اقبال
آئے تو قدرتی طور پر لیگ کی جاذبیت نے انہیں اپنی طرف متوجہ
کیا اور ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔“ ۱۳ه

علامہ کا خطبہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر

یہ وہ دور ہے جب ”سیاسی وطنیت“ (متحدہ قومیت) اور ”مسلم قومیت“ کے نظریے موضوعِ بحث بنے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی ملی انفرادیت اور جداگانہ نیابت کا پروگرام لے کر نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے ان نظریوں پر بہت کچھ لکھا جا رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ نے ۱۹۱۰ء میں ایک انگریزی مقالہ لکھا۔ جو علی گڑھ محمڈن کالج میں پڑھا گیا۔ بعد ازاں اس کا ترجمہ ”ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر“ سے ہوا۔

مسلم قومیت اور ہندو قومیت کے موضوع پر حضرت علامہ کی یہ پہلی نثری تحریر ہے۔ بہت مفصل اور جامع ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اسے پورے کا پورا یہاں نقل کر دیا جائے۔ لیکن اس کی گنجائش نہیں۔ حضرت علامہ کی یہ تحریر نایاب تو نہیں لیکن پھر بھی بہت کم تحریروں میں اس کے حوالے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حضرت علامہ کے سیاسی نظریات کو سمجھنے کے لیئے اس کا مطالعہ از حد ضروری اور ناگزیر ہے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

(الف) ملت اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور عصبیت کے بارے میں فرماتے ہیں :-

---

۱۳ه ملفوظات اقبال تالیف محمود نظامی مطبوعہ لاہور بار دوم ص ۱۰۲، ۱۰۳۔

”مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان نہ اشتراکِ وطن نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی ہے۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی۔ اس لیئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں۔ وہ بھی ہم سب کے لیئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دار و مدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے۔ جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے۔ جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائل مخصوصہ و شمائل مختصہ پر منحصر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا۔ اس کی پولٹیکل نشو و نما میں بہت بڑا حصہ لیا۔ لیکن اسلامی علوم و فنون اور فلسفۂ حکمت کے انمول موتیوں کو رولنے کا کام
یہ وہ کام ہے جو نفس ناطقۂ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے۔ زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ اسلام کا ظہور عرب قوم کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی ایک آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا۔ لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کی آماجگاہ

دُنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
پھر اک انوپ ایسی سونے کی مُورتی ہو
اس ہر دوار دل میں لاکر جسے بٹھا دیں
سُندر ہو اس کی صورت، چھب اس کی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں
زنار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
آنکھوں کی ہو جو گنگا لے کے اس کا پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں
پہلو کو چیر ڈالیں، درشن ہو عام اُس کا
ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگا دیں
"ہندوستان" لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھُولے ہوئے ترانے دُنیا کو پھر سُنا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں میں، ناقوس کو چھپا دیں
اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جسکو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اک آگ میں جلا دیں

ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حبِ وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے. ہم مسلمانوں کی "عصبیت" پر نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصب کہہ کر پکارتے ہیں. حالانکہ ہماری عصبیت ایسی ہی حق بجانب ہے. جیسی کہ اُن کی حق پرستی"[۱۴]

(ب) مسلمانوں کی مذہبی عصبیت

"اقوامِ عالم پر نظر ڈالیے. ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو. کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجیے. وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا. اس لیئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مَس نہیں کیا. جو اس کی قومیت کی روحِ رواں ہے. لیکن ذرا اس کے تمدن اس کے ملک یا پولیٹیکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پر تو حرف گیری کر دیکھیے. پھر اس کی جبلّی عصبیت کا شعلہ بھڑک نہ اُٹھے تو جانیں. بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیت کا انحصار اس کے معتقداتِ مذہبی پر نہیں ہے. بلکہ جغرافی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے. پس جب آپ اس خطۂ زمین پر جسے اس نے اپنے تخیل میں اپنی قومیت کا اصلی اصول قرار دے رکھا ہے معترض ہوتے ہیں. تو آپ اس کی عصبیت کو واجبی طور پر انگیخت کرتے ہیں. لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے ہماری قوم ایک شئے معہود فی الذہن ہے. موجود فی الخارج نہیں ہے. بلحاظ ایک قوم ہونے ہم جس مرکز پر آ کر جمع ہو سکتے ہیں وہ

[۱۴] خطباتِ اقبال مرتبہ رضیہ فرحت بانو مطبوعہ دہلی اپریل ۱۹۴۷ء ص ۸۹ تا ۹۱.

مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشراقی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو بُرا کہنا ہماری آتشِ عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے۔ تو میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصّے سے کچھ کم واجبی نہیں ہے جو اپنے وطن کی برائیاں سن کر بھڑک اٹھتا ہے . . . . اسلام کی حقیقت ہمارے لیئے یہی نہیں ہے۔ کہ وہ ایک مذہب ہے۔ بلکہ اُس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا۔ جب تک کہ ہم اصول اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بہ الفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے۔ وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا“ [۱۵]

(ج) اسلامی علوم اور جدید تعلیم | ”ایک قلیل البضاعت مسلمان جو سینے میں درد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو میری رائے میں قوم کے لیے بمقابلہ اس بیش قرار تنخواہ پانے والے آزاد خیال گریجوایٹ کے زیادہ سرمایۂ نازش ہے۔ جس کی

---

[۱۵] ایضاً ص ۹۱ تا ۹۴۔

نظروں میں اسلام اصولِ زندگی نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک آلۂ جلب منفعت ہے جس کے ذریعے سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کیئے جا سکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصر کو لامحالہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ کہ ہمارے عقلی و ادراکی گہوارے کو جھُلانے کی خدمت مغرب ہی نے انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین میں ہم شاید ابھی تک عربی یا ایرانی ہونے کے زیادہ تر یونانی نظر آرہے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ کہ خود ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام متعلمین کی قومیت پر حرف لائے بغیر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دار العلوم کی ضرورت میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی۔ بشرطیکہ یہ دار العلوم ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی۔ جو اسے اُس کے ایامِ گذشتہ سے جوڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے لیئے تو اس متعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں۔

مسلمان کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز رفتار کے قدم بقدم چاہیئے۔ لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی

ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا. جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قوم تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں. ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں. بلکہ ایک ایسا گروہ نیا پیدا کر رہے ہیں جو بوجہ کسی امتیازی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا. اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک میں ضم ہو جائے گا. جس میں اس کی بنسبت زیادہ قوت و جان ہو گی۔

لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے. کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں. اس لیئے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے. اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لیئے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیئے. الندوہ، علی گڑھ کالج، مدرسہ دیوبند اور اسی قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں، اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے. ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلم

ہونا چاہیئے. جہاں افرادِ قوم نہ صرف قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں. بلکہ تہذیب کا وہ اصول یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانۂ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھلنا چاہیئے. پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلم قائم کیا جائے. جس کی مسند نشیں اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دل کش انداز سے ہوتی ہو»[۱۶]

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ لیکچر اس وقت علی گڑھ محمڈن کالج میں پڑھا جا رہا تھا. جب تمام ہندوستان کے دردمند اور مخلص مسلمان اسے یونیورسٹی کی شکل دینے کی کوشش کر رہے تھے. آخر ان باہمت مسلمانوں کی مساعی کامیاب ہوئی. اور ۱۹۲۰ء میں عین اس وقت جب نادان خلافتیے مسلمانوں کی اس سب سے بڑی تعلیمی درسگاہ کو "نسیاً منسیاً" کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا.

اس لیکچر میں حضرت علامہ نے علی گڑھ کالج اور دیگر اسلامی درسگاہوں مثلاً، الندوہ اور دیوبند وغیرہ کے کارکنوں کو چند مفید تعلیمی اور اصلاحی مشورے بھی پیش کیئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر یہ درسگاہیں مثالی بن سکتی تھیں اور ان سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا دین و دنیا کی زیادہ بہتر خدمت کر سکتے تھے. علی گڑھ والوں نے تو حضرت علامہ کی نصیحت اور مشوروں کو پلے باندھ لیا. حتی الامکان اس پر عمل بھی کیا. لیکن دیوبند "گاندھویت" کی راہ پر گامزن ہو کر "صراطِ مستقیم" سے بہت دُور جا پڑا. یہی وجہ ہے کہ علوم اسلامی کے جتنے بلند پایہ سکالرز (مفکر) علی گڑھ نے

[۱۶] وہی ص ۱۰۳ تا ۱۰۵۔

پیدا کیے ہیں دیوبند یا ندوہ نے نہیں۔ صرف تین نام ملاحظہ ہوں۔

۱. ڈاکٹر سید ظفر الحسن (دم ۱۹۴۹ء)

۲. سید سلیمان اشرف صدر شعبہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی (دم ۱۹۳۹ء)

۳. مولانا فضل الرحمٰن انصاری (دم ۱۹۷۴ء)

ڈاکٹر سید ظفر الحسن عصر حاضر میں حضرت علامہ کے بعد سب سے بڑے مسلم مفکر اور حکیم تھے۔ مشہور مؤرخ، ادیب اور لیگی کارکن مولانا راغب احسن ایم۔ اے صاحب اپنے مقالہ "سید ظفر الحسن مرحوم کے پانچ تاریخی کارنامے" میں لکھتے ہیں۔

"علامہ سید ظفر الحسن ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پنجاب کے رہنے والے اور علی گڑھ کے شیخ اعظم اور روح رواں تھے جرمنی اور آکسفورڈ سے فلسفہ اور حکمت کی انتہائی ڈگریاں رشد و فضیلت کی حاصل کی تھیں۔ علی گڑھ میں شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین تھے۔ علوم عربیہ اسلامیہ اور غربیہ المانیہ و انگلزیہ کے امام عصر تھے۔ حق یہ ہے علوم اسلامیہ حاضرہ کے اندر حضرت علامہ کے بعد ان کے پایہ کا کوئی دوسرا المحقق حکیم و عارف عصر اس زمانہ میں یورپ و ایشیا میں نہیں تھا اور ان کا یہ درجہ مشرق و مغرب نے تسلیم کر لیا تھا۔

وہ نہ صرف حکیم و فیلسوف اعظم تھے، بلکہ زبردست صاحب طریقت، صاحب ذوق، صاحب باطن و حال اور پکے مومن و مسلمان تھے۔ ان کا قول تھا کہ مشرق و مغرب کے علوم و حکمت کھنگال ڈالنے کے بعد صرف دو باتیں سیکھی ہیں وہ یہ کہ دنیا میں صرف ایک کتاب ہے اور وہ قرآن اور دنیا میں صرف ایک انسان ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ فلسفہ و حکمت میں سید ظفر الحسن علامہ اقبال

کی طرح اپنے ایک مستقل جداگانہ ممتاز مذہب حکمت کے بانی ہوئے ہیں۔ ان کے رشد و کمال کا یہ درجہ تھا۔ کہ سید ظفر الحسن کی تصوری و حکمت پر لوگوں نے مقالات اور تھیسس لکھ لکھ کر برلن اور جرمنی کی دوسری یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ایک صاحب نے ظفر الحسن کا نظریہ حقیقت و عینیت

(Dr. Zafrul-Hasan's Theory of Realism)

لکھ کر جرمنی میں پیش کیا تھا جس پر حکماء جرمنی اور فلاسفہ مغرب نے صاحب مقالہ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی تھی"۔ [۱]

مولانا سید سلیمان اشرف کی دینی بصیرت و علمی کمالات کا اعتراف کرنے والوں میں سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، خواجہ حسن نظامی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ ہر روز نماز عصر کے بعد مسجد میں درس قرآن دیتے۔ جس میں طلباء کے علاوہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور وائس چانسلر تک کسب فیض کے لیئے حاضر ہوتے۔ پروفیسر عبید اللہ قدسی جناب پروفیسر ایم۔ ایم احمد صاحب کی زبانی مولانا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"ڈاکٹر (پروفیسر ایم۔ ایم احمد) صاحب مولانا سلیمان اشرف صاحب کے تعلق کو اس طرح بیان کیا کرتے تھے کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب ہندوستان کے مشہور عالم، علی گڑھ میں سب کے استاد تھے۔ دینیات کے ڈین تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین وغیرہ سب ان کے شاگرد تھے اور بہت احترام کرتے تھے۔ مولانا سیرت النبی

[۱] ہفت روزہ قندیل لاہور، ۹، ستمبر ۱۹۴۹ء ص ۱۱۔

کے بیان میں بے مثال تھے۔ فلسفہ میں مولانا ہدایت اللہ رامپوری کے شاگرد تھے۔ لیکن جب سیرت النبی کے بیان کے لیے کھڑے ہوتے تو مولانا ہدایت اللہ خاں ان کے جوتے اپنے بغل میں لے کر کھڑے ہوتے اور کہتے میاں! تم اس کا بیان کرتے ہو۔ جس کا میں ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ اس وقت تم مسندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو اور میں سننے والا ہوں۔" [۱۸]

جناب سید امیر الدین قدوائی بیان کرتے ہیں:۔

"حضرت مولانا پروفیسر سید سلیمان اشرف صاحب قبلہ بڑے جید عالم اور متواضع درویش تھے۔ وہ اپنی طرف سے تفسیر کا درس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مسجد میں دیا کرتے تھے اور جو لوگ اس میں شرکت کرتے تھے۔ صرف ان ہی کو شاگرد تسلیم کرتے تھے۔ وہ فیض کا دریا تھے جس نے حسب ظرف جو کچھ ان سے حاصل کر لیا۔ اس کی برکت اسی نے نہیں دنیا نے بھی دیکھی اور اس سے نفع پایا۔" [۱۹]

مولانا عربی زبان کے بلند پایہ سکالر تھے۔ جس کی گواہ آپ کی عظیم تالیف "المبین" ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن انصاری، علوم اسلامیہ میں سید سلیمان اشرف، فلسفہ میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور طریقت میں مولانا شاہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی کے تربیت یافتہ

---

[۱۸] ماہنامہ "تاج" کراچی محمود نمبر عبید اللہ قدسی "مقام محمود" ص ۸۷۔

[۱۹] ماہنامہ "تاج" کراچی محمود نمبر ۱۹۶۹ء سید امیر الدین قدوائی محمود بھائی ص ۱۱۲۔

تھے۔ آپ کی عظیم تصنیف (The Quranic Foundation and Structure of Muslim Society - 2 volumes)

کے بارے میں مؤرخ پاکستان ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ماہر قانون اے۔ کے بروہی کی آراء ملاحظہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"One of the finest contributions that have ever been made to the understanding of Islam. This book combines Orthodoxy with philosophy. It also combines progress and dynamism with the understanding of the religion." [۲۰]

ترجمہ "یہ کتاب اسلام کو سمجھنے کے لیے ایک بہترین کوشش ہے جو شاید ہی اس سے قبل کی گئی ہو۔ یہ کتاب مذہب اور فلسفہ کا حسین امتزاج ہے اور جدید ذہن کے لیے اسلام کی ترجمانی کرنے میں ممتاز طور پر کامیاب ہے۔"

اے۔ کے بروہی صاحب کا بیان ہے:۔

"I am distinctly of the opinion that it is a very valuable contribution to the Quranic literature, after Iqbal's lectures on the Reconstruction of Islamic Thought, the only other book that I can think of is Moulana's Book." [۲۱]

---

[۲۰] The "Minarat" Karachi July 1974

[۲۱] The "Minarat" Karachi July 1974.

ترجمہ: ”میری یہ واضح رائے ہے کہ یہ کتاب خطبات اقبال کے بعد قرآنی ادبیات میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ میرے ذہن میں خطبات اقبال کے بعد مولانا ہی کی کتاب ہے۔ جس میں اسلامی اصول و ضوابط کو بیان کرنے کی بلیغ کوشش کی گئی ہے۔“

ابوالکلام آزاد کا ابتدائی درخشاں دور

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس دور میں مسلم قومیت اور ہندی قومیت کے اثبات میں دونوں اطراف کے دانشور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ کچھ تو وہ لوگ تھے جو امتِ محمدیہ کے بقا و تحفظ کے لیئے نظریۂ ”مسلم قومیت“ کو اپنانا ضروری سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں میں سرفہرست حضرت علامہ اقبال تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو ”ہندی قومیت“ کے نظریہ کو دل و جان سے قبول کر چکے تھے اور اس کی تشہیر و تبلیغ کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں میں گاندھی، موتی لال نہرو، بدرالدین طیب جی اور دیو بندی علماء پیش پیش تھے۔ اسی زمانہ میں ایک نئی علمی شخصیت ابھری۔ اس میں اور علامہ اقبال میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں صوفی گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ دونوں کا سرمایہ دین و دنیا عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ اس شخصیت نے مسلم قومیت کے تصور کے احیاء کے لیئے بڑی زوردار تحریریں لکھیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ ”ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیئے بھی اس کتاب (قرآن مجید) کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہ نما بنائے وہ مسلم نہیں۔ بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لیئے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ کہ اس کے پیرؤوں کو اپنی پولٹیکل پالیسی قائم

کرنے کے لیئے ہندؤوں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تنظیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے سامنے کھڑی ہو جائے۔ ان کا خود اپنا راستہ موجود ہے۔ راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتا پھریں۔ خدا ان کو سربلند کرتا ہے۔ وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں۔ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ کہ اس کی چوکھٹ پہ جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں۔“ [۳۲]

۲۔ ”انسان کی سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتہ خلقت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندانوں کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیئے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیئے تھی۔ قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے۔ جس نے انسان کی بنی ہوئی تفریقات پر نہیں۔ بلکہ تعبدی وحدت پر ایک عالمگیر اتحاد و اخوت کی دعوت دی اور کہا کہ یا ایھا الناس انا خلقنا کم

---

۳۲ بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء تالیف چوہدری حبیب احمد مطبوعہ لاہور ص ۲۷۱۔

من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔" ترجمہ: اے لوگو ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیئے کہ پہچانے جاؤ باہم۔ ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں۔ امتیاز اور شرف صرف اسی کے لیئے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔" انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصل رشتہ صرف ایک ہے اور وہی ہے جو انسان کو خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے۔ پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفان۔ پہاڑوں کی مرتفع چوٹیاں۔ زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔"[۲۳]

۳۔ "یہ برادری (مسلمان) خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا۔ بمجرد اس اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو، خواہ الجیریا کا وحشی، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندان کا عضو ہے۔ جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام

---

[۲۳] "الہلال"، ۲ نومبر ۱۹۱۲ء بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشلسٹ علماء تالیف حبیب احمد خاں مطبوعہ لاہور ص ۲۱۶، ۲۱۷۔

رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔"[۲۴]

۴۔ "ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت (وطنیت) اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اور قومیں بھی لیکن مسلمان کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں ہے۔ جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کی جغرافی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز یا مذہب یا بالفاظ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے۔ اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہو سکے گی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے آج دنیا قوم اور وطن کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے۔ مسلمانوں کے لیئے وہ صرف اسلام یا خدا کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں نیشن کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلہ میں اگر کوئی لفظ ہے تو خدا یا اسلام ہے۔"[۲۵]

۵۔ "ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالٹکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا ہے۔ ورنہ اپنی پولٹیکل پالیسی کے لیئے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہی ہندوؤں

---

[۲۴] "الہلال"، ۶ نومبر ۱۹۱۳ء بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشلسٹ علماء ص ۲۲۰۔

[۲۵] مضامین آزاد حصہ دوم بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشلسٹ علماء ص ۱۳۱۔

کی اقتدار کی ضرورت پیش آتی ہے"[۲۶]

اس عظیم شخصیت کا اسمِ گرامی ابوالکلام آزاد تھا۔ جو ایک بہت بڑے عالم دین مولوی خیرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے۔ مولوی خیرالدین صاحب درجن کے قریب بلند پایۂ دینی کتب کے مصنف ہونے کے علاوہ صاحبِ طریقت وارشاد بزرگ بھی تھے۔ حلقۂ ارادت بڑا وسیع تھا۔ صرف کلکتہ اور بمبئی میں آپ کے معتقدین ومریدین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ آن کی وفات کے بعد ابوالکلام بھی بحیثیت پیرِ طریقت مسند سجادگی کی زینت بنے رہے۔ چونکہ وہ ایک صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیئے ان کی ابتدائی تحریروں میں اولیاء اللہ سے محبت وعقیدت بھی جھلکتی ہے۔ ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

"اولیاء اللہ کا وہ گروہ جس قدر محبتِ الٰہی اور انقطاعِ ماسوی اللہ میں ترقی کرتا ہے۔ اتنا ہی اس کے اعمال میں اخلاقِ الٰہی اور نورِ ربانی کا ظہور بھی ترقی کرتا ہے اور ان کا روح فیضانِ الٰہی کے نزدیک تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تکمیلِ مرتبہ انسانیت تک اس کا ارتفاع ہو جاتا ہے اور یہی صراطِ مستقیم اور دینِ قیم کا آخری مرتبہ ہے۔ یہ وہ قانونِ ارتقا ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا"[۲۷]

---

[۲۶] وہی ص ۲۳۱۔

[٭] تفصیل کے لیئے ملاحظہ ہو "من کیستم" تالیف قریشی احمد حسین مطبوعہ کراچی ص ۶۶، ۶۷۔

[۲۷] الہلال ۱۹، اگست ۱۹۱۳ء بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۲۱۵

لیکن یہ سب اُس دور کی باتیں ہیں جب ابوالکلام آزاد صاحب واردھا کے مکتب میں نہیں پہنچے تھے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام پر اُن کا پورا پورا الیقین اور ایمان تھا۔ ان کے لیئے مثالی شخصیت جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب تھے نہ کہ مسٹر گاندھی۔ وہ ہر عمل اور اصول کو اسلام کی عینک سے دیکھتے تھے۔ لیکن گاندھویت کے جال میں پھنس کر ان پر کیا گزری اور بدقسمت مسلمان قوم ایک عظیم مفکر سے کس طرح محروم ہوگئی یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آیئے۔

حضرت علامہ نے ۱۹۱۱ء میں تقسیم ہند کا تصور پیش کیا

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۱۰-۱۱ء میں نہ صرف نظریاتی طور پر ہی نظریہ مسلم قومیت کے حامی ومبلغ تھے۔ بلکہ وہ اسی دور میں اس کے "تمکن" کے لیئے بھی کوشاں نظر آتے ہیں۔ ہمیں اس دور کی ان کی ایک ایسی تحریر ملتی ہے جس میں وہ ایک ایسے خطۂ ارضی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جہاں ان کے ہم قوم یعنی مسلمان اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"To try to cover Religion into a system of speculative knowledge is absolutely useless. The point that I have tried to bring out is that Islam has a far deeper significance for us than merely religion. It has a

national meaning for us. The idea of Islam is ultimately our home or country in which we live , move and have our being according to the tenants of Islam"

ترجمہ:۔ قیاس آرائیوں پر مبنی کسی علم سے مذہب کی تشریح کرنا قطعاً بے سود ہے۔ میں جو نکتہ واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ صرف مذہب کی بہ نسبت ہمارے لیئے اسلام کی کہیں زیادہ اہمیت ہے۔ یہ ہمارے لیئے قومی مفہوم رکھتا ہے۔ اسلام کا نظریہ بالآخر ہمارے لیئے ایک ایسا گھر یا ملک ہے جس میں ہم اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔[۲۸]

جداگانہ نیابت

چونکہ مسلم قومیت کا احیا اور علیحدہ اسلامی مملکت کا قیام حضرت علامہ کے پیشِ نظر تھا اور ان دونوں کے حصول کے لیئے "جداگانہ نیابت" کا اصول بھی ایک بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیئے علامہ نے شروع سے لے کر آخر تک ہر اس تجویز اور تحریک کی مخالفت کی جس میں جداگانہ نیابت کو نظر انداز کردیا گیا ہو۔ ۱۹۱۶ء کا مسلم لیگ اور کانگرس سمجھوتہ (جو عرفِ عام میں لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے) تمام تر خامیوں کے باوجود حضرت علامہ کے نزدیک اس لیئے قابلِ قبول تھا کہ اس میں پہلی دفعہ واضح طور پر جداگانہ نیابت کے اصول کو تسلیم کیا گیا تھا۔

---

۲۸ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۹ نومبر ۱۹۷۵ء علامہ نے برصغیر میں علیحدہ وطن کا مطالبہ ۱۹۱۱ء میں پیش کیا۔ از ریاض حسین ایم۔ اے۔

تحریک ترک موالات کے طوفان میں ملی تشخص اور مسلم تعلیمی اداروں کو بچانے کی کوشش

۱۹۱۹-۲۰ء میں جب تحریک ہجرت، تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات کا ہولناک طوفان اٹھا۔ تو شروع شروع میں حضرت علامہ بھی خلافت کمیٹی پنجاب کے سیکرٹری بن گئے لیکن جلد ہی انہوں نے کمیٹی کے دیگر ممبران کے نامعقول رویہ اور غیر معتدل سرگرمیوں کی وجہ سے اس سے استعفیٰ دے دیا۔

سید وحیدالدین فقیر صاحب لکھتے ہیں:۔

"علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد ۱۹۲۱ء میں ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد سیالکوٹ میں وکالت کر رہے تھے اور تحریکِ خلافت میں حصہ لے رہے تھے۔ ان کے والد شیخ عطا محمد نے اپنے بھائی علامہ اقبال سے اس کا ذکر کیا۔ تو اقبال نے انہیں بتایا کہ وہ بھی تحریکِ خلافت کمیٹی کے سکریٹری رہ چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا کہ انہوں نے اس سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ استعفیٰ کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ "خلافت کمیٹی" کے بعض ممبر ہر جگہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے وہ بظاہر جوشیلے مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن در باطن اخوان الشیاطین ہیں۔ اس استعفیٰ کے وجوہ اس قابل نہ تھے۔ کہ پبلک کے سامنے پیش کیئے جاتے۔ اگر پیش کیئے جاسکتے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوتی۔"[۲۹] شیخ اعجاز احمد کے اس بیان کی تصدیق حضرت علامہ کے ایک خط سے بھی

---

۲۹ روزگارِ فقیر جلد دوم تالیف فقیر سید وحیدالدین مطبوعہ کراچی بار چہارم ص ۱۸۔ بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۸۲۔

ہوتی ہے۔ جو انہوں نے ۱۱ فروری ۱۹۲۰ء کو خان نیاز الدین خاں کو لکھا۔ فرماتے ہیں:۔

"گرامی صاحب کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیجئے۔ سنا ہے
وہ مجھ پر ناراض ہیں کہ میں نے خلافت کمیٹی سے کیوں استعفیٰ دے دیا
وہ لاہور آئیں تو ان کو حالات سے آگاہ کروں۔ جس طرح یہ کمیٹی قائم
کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبروں کا مقصد تھا اس کے اعتبار سے
اس کمیٹی کا وجود میری رائے میں مسلمانوں کے لیے خطرناک تھا"۔[۳۰]

حضرت علامہ کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تحریک ترک موالات کے زبردست مخالف اور اس کے طریقہ کار سے سخت بیزار تھے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ ایسی تحریروں کے موجود ہوتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب اور محمد حنیف شاہد صاحب وغیرہ کیسے حضرت علامہ کو اس تحریک کا حامی ثابت کر رہے ہیں۔ اس موقع پر رئیس الاحرار کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تحریک ترک موالات سے حضرت علامہ کی مخالفت کی دو وجہیں تھیں ایک تو وہ مسلم تعلیمی اداروں کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی اور دوسرے اپنے ملی تشخص پر "گاندھویت" (مولانا راغب احسن ایم۔ اے کے الفاظ میں جدید کفر) کو ترجیح دے رہی تھی۔ اس کی تفصیل تو ہمارے مقالہ "علامہ اقبال اور تحریک موالات" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

مختصراً یوں ہے:۔

[۳۰] مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان مطبوعہ لاہور ۱۹۵۴ء ص ۲۷۔

۱۔ مسلم تعلیمی ادارے

ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی جدید علوم کی درس گاہیں صرف تین تھیں۔ ایک علی گڑھ میں دوسری لاہور میں اور تیسری پشاور میں۔ تحریک خلافت کے کارکن گاندھی کے بہرے میں آکر ان کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دینا چاہتے تھے اور بزعم خود علی گڑھ اور لاہور میں ایسا کر بھی چکے تھے۔ حضرت علامہ دل سے چاہتے تھے کہ یہ درسگاہیں نادان دوستوں کی یلغار سے محفوظ رہیں۔ اس زمانہ میں ہندوستان بھر میں مسلموں اور غیر مسلموں کی جتنی درسگاہیں تھیں ان کی تفصیل مولانا سید سلیمان اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بے مثل تصنیف "النور" میں دی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ہندوستان میں جس قدر کالج یا سکول سرکاری ہیں، اگرچہ نام و تنخواہ کا ان کے تعلق سرکار سے ہے۔ لیکن دراصل ان کا فیض ہندوؤں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ اختیارات وغیرہ کہیں بلا واسطہ اور کہیں بالواسطہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے تمتعات بھی اسی قوم کے حصہ میں ہیں۔ سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے صرف تین کالج ہیں۔ علی گڑھ لاہور اور پشاور میں۔ اس وقت ہندوستان میں مجموعی تعداد کالجوں کی ایک سو پچیس[۱۲۵] ہے۔ تین[۳] مسلمانوں کے اور ایک سو بائیس[۱۲۲] ہندوؤں کے۔ ان میں سے اگر سرکاری کالجوں کو جن کی کل تعداد چونتیس[۳۴] ہے الگ کر لیجئے۔ جب بھی اٹھاسی[۸۸] کالج خالص ہندوؤں کے رہ جاتے ہیں۔ ان میں بائیس[۲۲] کالج ایسے ہیں جن میں گورنمنٹ کی امداد قطعاً شامل نہیں اور چھیاسٹھ[۶۶] کالج ایسے ہیں جن میں گورنمنٹ کی امداد جاری ہے۔ تین[۳] اور اٹھاسی[۸۸] کی نسبت ذرا غور سے ملاحظہ کیجئے۔ تو پھر تعلیم کے ملیامیٹ کر دینے کا فیصلہ کیجئے۔ سارے کالجوں میں مجموعی تعداد

ہندوستانی طلبار کی چھیالیس ہزار چار سو سینتیس (۴۶۴۳۷) ہے۔ جن میں سے مسلمان طلبار چار ہزار آٹھ سو پچھتر (۴۸۷۵) ہیں۔ ہندو طلبار کی تعداد اکیالیس ہزار پانچ سو باسٹھ (۴۱۵۶۲) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو چوبیس (۲۴) کروڑ اور مسلمان سات کروڑ ہیں۔ اس تناسب سے جب کہ مسلمانوں کے تین کالج تھے۔ ہندوؤں کے بارہ (۱۲) تھے۔ مسلمان طلبار کی تعداد کالجوں میں چار ہزار (۴۰۰۰) تھی تو ہندو سولہ ہزار (۱۶۰۰۰) ہوتے۔ لیکن جب کہ واقعہ نمونۂ عبرت پیش کر رہا ہو۔ تو مسئلہ تعلیم کو تہہ و بالا کرنے میں کس کا نقصان ہے۔ جس قوم کی تعلیمی حالت یہ ہو کہ سات کروڑ میں سے صرف چار ہزار مشغولِ تعلیم ہوں، اس قوم کا یہ ادعا اور ہنگامہ کہ اب ہمیں تعلیم کی حاجت نہیں۔ اگر خبط اور سودا نہیں تو اور کیا ہے۔" ؎

یہ تھے اس زمانہ کے مسلم تعلیمی اداروں اور زیرِ تعلیم مسلم طلباء کے اعداد و شمار سے مقابلہ کیجیئے تو ان بزرجمہروں کی عقل و دانش پہ رونا آتا ہے جنہوں نے مسلمانوں کی بایں درجہ تعلیمی زبوں حالی کے باوجود علی گڑھ اور لاہور کی مسلم درسگاہوں کو ملیت و نابود کرنے کی قسم کھائی ہوئی تھی اور ساتھ ہی ان باکمال ہستیوں کے لیئے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔ جن کی ہمت و کوشش کے طفیل یہ درسگاہیں جزوی نقصانات اٹھانے کے باوجود قائم و دائم رہیں اور تحریکِ پاکستان کے دوران مسلمان قوم کی پشت و پناہ بنی رہیں۔ تحریکِ پاکستان کے تمام عظیم رہنما ان ہی دونوں درسگاہوں کے تربیت یافتہ تھے۔

ع   خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

؎ "النور" تالیف سید سلیمان اشرف مطبوعہ علی گڑھ بار اول ۱۹۲۱ء ص ۱۹۶، ۱۹۷۔

۲۔ تحریکِ ترکِ موالات سے حضرت علامہ کی دلی نفرت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس طوفانِ بے محابا میں مسلمانوں کی ملی انفرادیت کی کشتی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ مسلم قومیت کے بجائے ہندی قومیت کا دور دورہ تھا۔ یہاں تک کہ ایک عظیم مسلمان رہنما کے نزدیک گاندھی کا درجہ "بعد از خدا بزرگ توئی" کا ہو گیا تھا۔ قرآن اور وید ایک سطح پر آگئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان اپنی انفرادیت کھو کر ہندو اکثریت میں جذب ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں۔

جنگِ عظیم اول سے بعد کی تحریکات اور ان کے اثرات کا جائزہ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم مدیر "ادبی دنیا" نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کھینچا ہے:-

"جنگِ عظیم کے دوران میں ایک جبرِ عظیم نافذ رہا۔ لیکن اس کے ختم ہوتے ہی قومی آزادی کا ولولہ انگریز دشمنی کے ایک شدید جذبہ کے ساتھ مل کر ایک سیلِ رواں کی صورت میں بہہ نکلا اور اپنی یلغار میں اُن بیشتر تعمیری میلانات کو بھی بہالے گیا جنہیں سرسید کی تحریک نے جنم دیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کا انتشار، جامعہ ملیہ کا قیام، تحریکِ ہجرت، ترکِ ملازمت اور عدمِ تعاون اس سیلابِ انقلاب

؎ تفصیل کے لیئے ملاحظہ کریں۔

۱۔ "النور" تالیف سید سلیمان اشرف۔

۲۔ "مسلمانوں کا ایثار اور جنگِ آزادی" تالیف عبدالوحید خاں۔

۳۔ "الحجۃ المؤتمنۃ فی آیات الممتحنۃ" تالیف مولانا احمد رضا خاں بریلوی ۱۹۲۰ء۔

۴۔ "تحقیقاتِ قادریہ" تالیف مولانا جمیل الرحمٰن بریلوی۔

کی چند یادگاریں ہیں جو جامعہ ملیہ کے سوا اس کے ساتھ بہتی ہوئی صحرائے عدم میں جا پہنچیں اور اس کی خشکیوں میں جذب ہو کر رہ گئیں" [۲۳]

مرکزی مجلس تبلیغ اور علامہ اقبال

تحریک عدم تعاون کو مسٹر گاندھی نے "چورا چوری کے واقعہ کو بہانہ بنا کر اپنے انجام تک پہنچا دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کا خوش نما اور بظاہر مستحکم قلعہ آناً فاناً دھڑام سے زمین پر آ پڑا۔ ہندوؤں کے دلوں میں چھپے ہوئے نفرت کے شدید جذبات شدھی اور سنگھٹن کے روپ میں پوری شدت اور زور سے ابھر آئے۔ ادھر چند مخلص مسلمانوں نے "دین محمدی" کی حفاظت و بقا کے لئے مرکزی مجلس تبلیغ قائم کی۔ جس کے رہنماؤں میں مولانا غلام بھیک نیرنگ اور مولانا عبدالماجد بدایونی رحمۃ اللہ علیہم جیسی فاضل ہستیاں شامل تھیں۔ حضرت علامہ اور دیگر دردمند مسلمانوں مثلاً پیر جماعت علی شاہ صاحب اور مولانا نعیم الدین مراد آبادی وغیرہم کی ہمدردیاں بھی شامل حال تھیں۔ مولانا غلام بھیک نیرنگ اپنے مضمون "اقبال کے بعض حالات" میں رقم طراز ہیں:۔

"ہندوستان میں ہندوؤں کی جانب کم از کم ستر سال سے کبھی خفیہ، کبھی اعلانیہ، کبھی انفرادی، کبھی منظم اور جماعتی سازشیں اور کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ کہ یہاں کے مسلمانوں کو مرتد کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل طویل ہے۔ ۱۹۲۳ء کے آغاز میں اسی سلسلہ کی ایک منظم اور اعلانیہ تحریک "شدھی"، آگرہ، متھرا، بھرت پور، ایٹہ وغیرہ اضلاع میں جاری ہوئی اور مسلمانوں نے اس حملہ کی مدافعت کے لئے ان شدھی زدہ علاقوں میں اپنے واعظ اور مبلغ بھیجے۔ اس زمانے میں جو تجربات اور

[۲۳] ماہنامہ "ادبی دنیا"، لاہور اکتوبر ۱۹۵۸ء

مشاہدات ہوئے۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم نے یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو بمشورہ و امداد بعض اکابر ملت مثلاً حاجی مولوی سر رحیم بخش، مولانا عبدالماجد بدایونی اور نواب عبدالوہاب خاں مرحوم ایک مرکزی "جمعیت تبلیغ اسلام" قائم کی۔ جو بفضلہ اب تک قائم ہے چونکہ (حضرت علامہ) اقبال کو تبلیغ و اشاعت اسلام کا خاص شوق تھا وہ ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ہماری اس جمعیت کے ممبر بن گئے۔" [۲۴]

حضرت علامہ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۹۲۸ء میں بھی اُن کو اس جمعیت سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی کہ ۱۹۲۳ء میں۔ میر غلام بھیک نیرنگ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام تمام کاموں پر مقدم ہے اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظت اسلام اس عنصر کا مقصد نہیں ہے۔ جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے۔ تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد، ہندوستان کے سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لئے ایک خطرہ عظیم ہے اور میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے

[۲۴] میر غلام بھیک نیرنگ "اقبال کے بعض حالات"، سہ ماہی اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۲۶۔

میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہر حال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے۔ اس کا اجر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشاء اللہ جہاں جہاں موقع ملے گا آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں۔ مگر آپ اور مولوی عبد الماجد جنوبی ہند کے دورہ کے لیئے تیار ہیں،، ۳۵

آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا قیام

ان ہی حالات میں نہرو رپورٹ منظرِ عام پر آئی۔ جس کی حضرت علامہ اقبال اور ہر اسلامی ذہن و قلب رکھنے والے مسلمان نے مخالفت کی۔ مسلم لیگ جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکی تھی۔ دو حصوں میں بٹ گئی۔ جناح لیگ اور شفیع لیگ۔ شفیع لیگ میں علامہ اقبال اور مولانا حسرت موہانی جیسے نابغۂ روزگار لوگ شامل تھے۔ دوسری جانب جناح لیگ میں حضرت قائداعظم اور ان کے قابل ترین ساتھی اب بھی ہندو مسلم اتحاد کی موہوم امید اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ حالانکہ نہرو رپورٹ کو دیکھتے ہوئے یہ امید ایک سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

علامہ اقبال اور ان کے ساتھی جداگانہ انتخاب کے حامی تھے۔ جب کہ قائداعظم اور ان کے رفیق مناسب تحفظات کے ساتھ مخلوط انتخاب کے۔ چونکہ مسلم لیگ تقسیم ہو کر کافی کمزور ہو چکی تھی اور مسلمانوں کی نمائندگی اہل نہیں رہی تھی۔ اس لیئے اس جگہ اب ،، آل پارٹیز مسلم کانفرنس ،، نے لے لی۔ جو مسلم لیگ جناح

۳۵ مکتوب اقبال بنام غلام بھیک نیرنگ ۵ دسمبر ۱۹۲۶ء سہ ماہی اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۴۲۔

گروپ، مسلم لیگ شفیع گروپ، جمعیت العلماء ہند اور آل انڈیا خلافت کمیٹی پر مشتمل تھی۔ اس کانفرنس کا پہلا جلسہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء تا یکم جنوری ۱۹۲۹ء دہلی میں سر آغا خاں کی صدارت میں ہوا۔ ماسوائے چند تمام مسلم قائدین اس میں شریک ہوئے طبقۂ علماء میں سے بھی مولانا عبد الماجد بدایونی (سنی) مولانا آزاد سبحانی (سنی) مولانا کفایت اللہ (دیوبندی) اور مہدی حسن مجتہد لکھنوی (شیعہ) شریک تھے۔ اس موقع پر میاں محمد شفیع کی ایک قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا۔

،، حضرات! گذشتہ تین چار سال سے ہم کو جو مشاہدات و تجربات حاصل ہو رہے ہیں۔ وہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہیں ہم کو جو باتیں اپنے برادرانِ وطن کے متعلق قیاسی طور پر معلوم تھیں۔ اب وہ یقینی طور پر ہمارے علم میں آگئیں۔

میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے لیئے جو راہ عمل قائم کی تھی۔ وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔

حضرات! آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنا ہے۔ تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لیئے سعی و کوشش کرنی چاہیئے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولٹیکل پروگرام بنانا چاہیئے۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں بعض ایسے حصے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔

آج ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیئے سعی و کوشش کر رہی ہے۔
پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیئے کوشش نہ
کریں۔ آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیوشن پیش ہوا ہے۔
وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیئے میرے پاس ایک
مذہبی دلیل ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم
نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہو
گا۔" [36]

جمعیت العلماء ہند دو حصوں میں بٹ گئی

جمعیت العلماء ہند شروع میں سنی اور دیو بندی دونوں مکتبہ ہائے فکر کے علماء وزعماء پر مشتمل تھی اور ہر ایسی تحریک و تجویز کی حمایت کرتی۔ جو مسلم مفاد کے لیئے ضروری ہوتی۔ اس کے نمائندے کانگرس، مسلم لیگ اور تحریک خلافت کے اجلاس میں شریک ہوتے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کا ایک حصہ مسلم مفاد سے آنکھیں بند کر کے کانگرس کا ہم نوا بن گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء میں "امروہہ" کے مقام پر اس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ جمعیت العلماء صرف کانگرس کا ساتھ دے گی۔
جناب محمد احمد خاں صاحب لکھتے ہیں:۔

"جمعیت العلماء نہرو رپورٹ کی مخالف، آل پارٹیز مسلم
کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی مؤید تھی اور اس نے آٹھویں سالانہ
اجلاس میں مسٹر جناح کے چودہ نکات کی حمایت کی تھی۔ لیکن مئی
۱۹۳۰ء میں جمعیت کا جو اجلاس "امروہہ" میں منعقد ہوا تھا۔ اس

[36] گفتار اقبال تالیف محمد رفیق افضل مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء بار دوم ص ۴۲، ۳۰۔

میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ
اشتراک عمل کرنے اور تحریک سول نافرمانی میں شرکت کا مشورہ
دیا تھا۔ اسی قرارداد پر جمعیت کے اندر اختلاف رونما ہوا اور اس
کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک آل انڈیا جمعیت العلماء دہلی اور
دوسری آل انڈیا جمعیت العلماء کانپور۔ جمعیت العلماء کانپور کا
(پہلا) اجلاس ۱۹۳۰ء میں زیر صدارت مولانا محمد علی جوہر منعقد ہوا۔
یہ جمعیت کانگرس اور اس کی تحریک سول نافرمانی کے خلاف تھی
اور گول میز کانفرنس میں شرکت کی حامی تھی۔" [37]

جمعیت العلمائے کانپور

جمعیت کا وہ حصہ جو کانگرس کی پالیسی کو مسلمانوں کے لیئے "سم قاتل" سمجھتا تھا۔ وہ کانگرس کے حامی دھڑے سے الگ ہو گیا اور اس نے "جمعیت العلمائے کانپور" کے نام سے نئی تنظیم قائم کر لی۔ اس نئی تنظیم میں بقول رضوان احمد صاحب مندرجہ ذیل علماء شریک تھے:۔

"مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا قطب الدین عبدالوالی
فرنگی محلی۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا شفیع داؤدی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی۔
مولانا عبدالحامد بدایونی۔ مولانا مظہر الدین۔ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی۔
مولانا نثار احمد کانپوری۔ مولانا فاخر الہ آبادی۔ مولانا نذیر احمد خجندی۔
اور مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ۔" [38]

[37] اقبال کا سیاسی کارنامہ تالیف محمد احمد خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء ص ۱۲۶، ۱۲۷۔
[38] روزنامہ "جنگ" راولپنڈی ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء

چونکہ جمعیت العلماء ہند کا ایک ٹکڑا باضابطہ طور پر کانگریس کا حامی و ہمنوا ہو چکا تھا۔ اس لیئے اس کی نمائندگی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں ختم ہو گئی۔ اب صرف دوسرا حصہ ہی جو جمعیت العلماء کانپور کے نام سے موسوم تھا۔ مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور و دہلی میں شامل ہوا۔

"۱۹ فروری ۱۹۳۳ء کو جب آل انڈیا پارٹیز مسلم کانفرنس کے ایگزیکٹو بورڈ کا اجلاس "قرطاس ابیض" (وائٹ پیپر) پر غور کرنے کے لیئے دہلی میں منعقد ہوا تو جمعیت العلماء کانپور کے مندرجہ ذیل نمائندوں نے شرکت کی۔ جب کہ جمعیت العلماء دہلی کا کوئی نمائندہ شامل نہ ہوا۔

۱۔ مولانا عبد الصمد مقتدری بدایوں۔

۲۔ مولانا عبد القدیر بدایوں۔

۳۔ مولانا غلام بھیک نیرنگ۔

۴۔ مولانا عبد الحامد بدایوں۔ ؎۱۹

حضرت قائد اعظم کی لندن سے واپسی کے بعد جب مسلم لیگ نے ان کی بے لوث قیادت میں پھر اصلی مقام حاصل کر لیا۔ تو "جمعیت العلماء کانپور" کے زعماء نے ہراول دستہ کے طور پر کام کیا۔ اور جمعیت کے رہنماؤں نے قریہ قریہ گاؤں گاؤں جا کر مسلم لیگ کا پیغام عوام تک پہنچایا اور ان کو ذہن نشین کیا کہ ایک مسلمان کا کانگریس میں شامل ہونا۔ اس کا اپنے موت کے پروانے پر دستخط

؎۱۹ تفصیل کے لیئے ملاحظہ ہو "نامۂ اعمال"، تالیف نواب سر یامین خاں جلد اول مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء ص ۴۳۲ تا ۴۳۵۔

کرنے کے مترادف ہے۔ ۱۹۳۷ء کے مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کے موقع پر مسلم لیگ کے چند لیڈروں نے قائد اعظم سے عرض کیا کہ ہمیں بھی کانگریسی علماء کی طرح ایک تنظیم قائم کرنی چاہیئے۔ جو ان کانگریسی ملاؤں کے پھیلائے ہوئے دینی انتشار کا مقابلہ کر سکے۔ تو حضرت قائد اعظم نے فرمایا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

"We have League Maulanas"

اس واقعہ کو ایک مشہور لیگی کارکن مرزا اظہر علی برلاس نے ایک انگریزی مضمون میں "League Maulanas" کی سرخی میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"Maulana Hussain Ahmad Madani started a tearing compaign against the league during the Muslim Mass Contact Movement under the special blessings of Pandit Jawaharlal Nehru. We feared that the Masses would be swayed by the Quran reciting beareded gentlemen than by English educated Muslim Politicians. But the Quaid-i-Azam have no truck with them. He would have "Now Maulanas" who would fight the League Cause, he declared and he did."

"Maulana Jamal Mian Firangi Mahli and Maulana Hamid Badayuni came into prominence. No corner of the subcontinent was left where the Holy Quran and Ahadis were not quoted and requoted by religion champions of the respective parties."

ترجمہ۔ "جب مولانا حسین احمد نے مسلم رابطہ عوام تحریک کے دوران پنڈت جواہر لال نہرو کی نوازشس ہائے خسروانہ کے تحت مسلم لیگ کے خلاف ایک شدید مہم کا آغاز کیا۔ تو ہمیں ڈر معلوم ہوا کہ عوام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان سیاست دانوں کے مقابلہ میں متشرع اشخاص سے زیادہ متاثر ہوں گے۔ لیکن قائداعظم کو کوئی خدشہ نہ تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے پاس بھی ایسی صاحب علم ہستیاں ہیں، جو مسلم لیگ کے نصب العین کے لیئے جد وجہد کریں گی۔ اور انہوں نے ایسا کر دکھایا۔

چنانچہ مولانا جمال میاں فرنگی محلی اور مولانا عبدالحامد بدایونی میدان میں آگئے اور برصغیر کا کوئی ایسا گوشہ نہ رہ گیا جہاں متعلقہ پارٹیوں کے مذہبی رہنماؤں نے قرآن و احادیث سے اقتباسات بطور حوالہ بار بار پیش نہ کیئے ہوں۔"

The Pakistan Times 25th December 1976

حضرت مولانا بدایونی اور جمال میاں فرنگی محلی صاحب کے میدان میں آجانے سے جمعیت العلماء کے پھیلائے ہوئے دینی انتشار کی قلعی کھل گئی۔ مسلمان عوام کو معلوم ہوگیا۔ کہ جمعیت العلماء کے رہنما جنہیں ہم غلطی سے اسلام کا ترجمان سمجھ رہے تھے۔ وہ حقیقت میں آستین کے سانپ تھے اور ان کا مقصد وحید صرف گاندھویت کا پرچار تھا۔ ان لیگی علماء کی کوشش سے ہندوستان بھر کی مساجد و دینی مدارس میں مسلم لیگ کے حق میں تقاریر و وعظ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جہاں مسلم لیگ کا جلسہ ہوتا۔ وہاں لیڈروں کی تقاریر کے بعد ایک نشست علماء و مشائخ کے لیئے بھی مخصوص ہوتی جس میں وہ اسلام کی حقانیت اور جمعیت العلماء کی غلط روش سے عوام کو روشناس کراتے۔ ایسی ہی ایک مجلس کا مولانا حسین احمد صاحب نے اپنے ایک خط بنام ابوالحسن حیدری غازیپوری میں ذکر کرتے ہوئے اپنے دل کے پھپھولے یوں پھوڑے ہیں :-

"مدینہ اخبار تو شاید آپ کے پاس براہ راست آتا ہے اس لیئے ارسال نہیں کرتا ہوں۔ لیگی حضرات مساجد کو اپنی جولان گاہ بنانے میں انشاء اللہ کامیاب نہ ہوں گے، کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تو پھر مسلم قوم کی بے راہ روی کا علاج ہی کیا ہے۔ آپ نے "مدینہ" ۵ صفر کے صفحہ ۲ کے مضمون جس کی سرخی "مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ایک عینی گواہ کے قلم سے" ہے دیکھا ہوگا۔ اب آپ ہی فرمایئے۔ کہ جس صوبہ میں ۷۵ رفیصدی سے زیادہ مسلمان بستے ہوں اور وہ لوگ بہ نسبت دوسرے صوبوں کے بہت زیادہ مذہبی شمار ہوتے ہوں۔ جب کہ وہاں کے مسلمانوں کی یہ مذہبی انقلابی حالت ہوگی۔ تو کیا امید کی جاسکتی ہے کہ

اس الحاد اور بے دینی کی کوئی حد بھی ہے۔ جمعیت علماء اس طوفان اور شورش میں کیا کر سکتی ہے اور خود علماء کس حال میں ہو گئے ہیں۔ کیا آپ کی نظر سے یہ نہیں گزرا کہ اسی پنڈال میں لیگ کے اجلاس کے بعد علماء کا اجلاس ہوا اور بھرچونڈی شریف کے پیر صاحب نے صدارت فرمائی۔ مولانا جمال میاں صاحب۔ صاحبزادہ مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی اور مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی اور بہت سے حضرات ان دنوں میں ان تمام اجلاسوں میں شریک رہے۔

جب حالت اس درجہ بدل گئی ہے۔ کہ مسلم عوام، ارباب طریقت، ارباب شریعت سب کے سب اس سیلاب کے نذر ہوتے ہوئے دین اور احکامِ دین سے برگشتہ ہوتے جاتے ہیں تو جمعیت کے مٹھی بھر آدمی اپنی خستہ حالی کے ساتھ کیا کر سکیں گے۔

ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

آپ کو معلوم ہے کہ جمعیت کے بھی اکثر سرگرم ارکان جیلوں میں بند ہیں۔ جو لوگ باہر ہیں وہ ڈیفنس کے آرڈیننسوں سے خائف ہیں۔ یہ ایسا ہتھیار ہے کہ جس کی نہ داد ہے نہ فریاد۔ جس کو چاہا دھر لیا۔ اول تو علماء میں عموماً احساس ہی نہیں اور جن کو کچھ ہے وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر ہراساں اور شلِ بید لرزاں ہے۔ پھر کس طرح بنے۔ ؎

بنے کیوں کر کہ ہے سب بات الٹی ہم الٹے یار الٹا بات الٹی [۲۱]

---

[۲۱] مکتوب شیخ الاسلام مرتبہ نجم الدین اصلاحی جلد اول مطبوعہ دیوبند ص ۲۳۸۔

یہ خط کیا ہے۔ ایک مایوس اور دکھی دل کی فریاد، اسے بار بار پڑھیئے کئی حقائق سامنے آئیں گے۔ جمعیت العلماء کانپور کی حکایت زلفِ یار کی طرح دراز ہو گئی اب پھر اصل موضوع کی طرف آیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہرو رپورٹ کے زمانہ سے لے کر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ حضرت علامہ کی زندگی کا مصروف ترین دور تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے باوجود خرابیٔ صحت قوم کی ______ عملاً اور ذہناً رہنمائی فرمائی۔ وہ جانتے تھے۔ کہ ان حالات میں ان کی خاموشی اور عافیت کوشی مسلمان قوم کو موت کے گڑھے میں دھکیل سکتی ہے۔ اس دور میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اجمالاً یوں ہے۔

نہرو رپورٹ کی مخالفت۔ خطبۂ الہ باد۔ خطبہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس لاہور۔ گول میز کانفرنس میں شرکت۔ قائد اعظم کو لندن سے واپس بلانے کی کوشش۔ پنجاب مسلم لیگ کی صدارت باوجود خرابیٔ صحت قبول کرنا اور تحریک مسجد شہید گنج میں نمایاں کردار ادا کرنا اور سب سے آخر میں مولوی حسین احمد دیوبندی صاحب کے اسلام سوز اور اسلام کش نعرۂ وطنیت کی بھرپور اور مدلل مخالفت وغیرہ۔ ان تمام واقعات اور ہنگاموں کے دوران وہ تمام اصول ان کے پیش نظر رہے۔ جن پر وہ ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک پورے تیس سال سے پوری سختی سے عمل پیرا رہے۔ وہ اصول یہ تھے۔

۱۔ مسلم قومیت کا احیاء

۲۔ مسلم قومیت کے تحفظ اور بقا کے لیئے ایک علیحدہ مملکت کا حصول۔

۳۔ نظریۂ وطنیت کی مخالفت۔

۴۔ جداگانہ نیابت۔

ان کی اگر کسی سے دوستی تھی تو ان اصولوں کی حفاظت کے لیئے اور اگر کسی سے عداوت تھی تو ان ہی اصولوں کی بنا رپر یہ ہے حضرت علامہ کی پوری سیاسی زندگی کا مختصر سا خاکہ اور اس کی ضرورت اس لیئے پیش آئی کہ جب تک حضرت علامہ کی پوری سیاسی زندگی کو سامنے نہ رکھا جائے۔ اس وقت تک حضرت علامہ کے اس قطعہ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ⁂ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است الخ

کا سمجھنا مشکل ہے۔ اب ہم اصل موضوع "معرکہ اقبال و حسین احمد" پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

باب دُوم

"نظریہ" ملت از وطن است" کا پسِ منظر

مولوی حسین احمد کا نعرہ، قومیں اوطان سے بنتی ہیں

جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ حضرت علامہ اوائل ہی سے "متحدہ قومیت" کے نظریہ کے سخت مخالف تھے۔ اُن کی زندگی کا مقصدِ وحید "مسلم قومیت" کا احیا اور دینِ مصطفٰےؐ کی عزت و آبرو کو قائم و بحال رکھنا تھا۔ اُن کی پوری سیاسی زندگی میں جو تیس سال کو محیط ہے ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا ہے جب اُنھوں نے اپنے مسلک اور نظریہ کو پسِ پشت ڈالا ہو۔

"قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے نظریہ سے اُن کے کان ابتدا ہی سے آشنا تھے جہاں ہندو من حیثیت الجماعت اور چند ناعاقبت اندیش مسلمان رہنما اس نظریہ کے مبلغ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے وہاں حضرت علامہ اور دیگر دردمند مسلمان اس نظریہ کی تردید میں مدلل و مسکت بیانات و تحریریں شائع کر رہے تھے۔ لیکن جب دیوبند کی اسلامی درسگاہ کے صدر مولوی حسین احمد صاحب نے بھی یہی راگ الاپا تو حضرت علامہ کو قدرتی طور پر جو شدید رنج ہوا اس کی کئی وجوہ تھیں۔

ایک تو یہ کہ مولوی صاحب اپنے مکتبۂ فکر کے سب سے بڑے عالم اور نمائندے تھے۔ اُن کا حلقۂ اثر بھی کافی وسیع تھا اور ان کے اس مسلک یا نظریہ کا اثر اُن کے حلقۂ اثر علماء اور عوام پر پڑنا لازمی تھا۔

دوسرے حضرت علامہ نے دارالعلوم دیوبند سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان کا خیال تھا جب بھی قوم پر کوئی مشکل وقت آیا تو یہ دارالعلوم سوادِ اعظم کے ساتھ مل کر مسلم مفاد کے لیے ہراول دستہ کا کام دے گا۔ لیکن یہاں مولوی حسین احمد صاحب اور اُن کے ساتھی حضرت علامہ کی امیدوں اور آرزوؤں کے برعکس

مسٹر گاندھی کے اشارۂ ابرو پر دین و ایمان نثار کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور اس باطل نظریہ کو حق ثابت کرنے کے لئے قرآن و حدیث کی عجیب عجیب تاویلیں کی جا رہی تھیں۔ بے سروپا دلائل تراشے جا رہے تھے۔ ایسی حالت میں اگر حضرت علامہ کا عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھرپور دل تڑپ اٹھا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

"قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے نظریہ کا پس منظر

ہم پہلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کا نظریہ کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ پون صدی سے ہندو رہنما اور اُن کے ساتھی مثلاً تلک موتی لال نہرو۔ گاندھی۔ جواہر لال نہرو۔ ابوالکلام آزاد، سید محمود اور عبیداللہ سندھی وغیرہم اس کی تبلیغ و پرچار کر رہے تھے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "معرکۂ اقبال و مدنی" کی بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے چند آزاد خیال اور نسبتاً غیر متعصب ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے ان فرموداتِ عالیہ کا نقشہ قارئین کے ان فرموداتِ عالیہ کا نقشہ قارئین کے سامنے تفصیل سے پیش کر دیا جائے جو وہ ہندو مت کے احیا اور مسلم قومیت کے ختم کرنے کے لئے آئے دن پریس میں دے رہے تھے۔

مسٹر گاندھی

سب سے پہلے ایک نام نہاد فراخ دل اور وسیع النظر ہندو رہنما مسٹر گاندھی کے وطنیت اور متحدہ قومیت کے بارے میں ارشادات ملاحظہ ہوں۔

(ا) ایک نیک کام میں مسلمانوں کی مدد کرنا ہندوستان کی خدمت کرنا ہے اس لئے کہ مسلمان اور ہندو ایک ہی خون سے پیدا ہوئے ہیں اور ایک ہی ماں (بھارت ماتا) کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔"[1]

مندرجہ بالا بیان ۱۹۲۱ء کا ہے اس سے پورے اُنیس سال بعد یعنی ۱۹۴۰ء کا ارشاد ملاحظہ ہو۔

(ب) "عملی زندگی میں ہم دونوں (یعنی ہندو اور مسلمان) کو دو جداگانہ قوموں میں

[1] ینگ انڈیا ۲۸ جولائی ۱۹۲۱ء بحوالہ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ص ۱۹۲

تقسیم کرنا ممکن ہے ہر مسلمان اگر اپنے خاندان کی تاریخ میں دور تک پیچھے جائے تو اُسے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام ہندو نام ہے۔ ہر مسلمان دراصل ہندو ہی ہے جس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ایسا کرنے سے کوئی جداگانہ قومیت تو پیدا نہیں ہوتی "[۲]

اب ہندو دھرم کے ساتھ وفاداری بشرط استواری ملاحظہ ہو:-

(ج) "میں ہندو دھرم کے بارے میں اپنے جذبات کو الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح جیسے اُن جذبات کو بیان نہیں کر سکتا جو میں اپنی بیوی کے بارے میں رکھتا ہوں۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ میری بیوی میں خامیاں نہیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے ایک ایسے رابطے کا احساس ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا یہی احساس ہندو دھرم کے بارے میں اس کی خامیوں اور کمیوں کے باوجود رکھتا ہوں۔ میں شدت سے مذہبی اصلاح کا حامی ہوں۔ لیکن میرا یہ جوش کبھی بھی اس حد تک نہیں پہنچا کہ ہندو دھرم کے بنیادی ارکان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر دوں۔"[۳]

مسٹر گاندھی کو ہندو آریائی تمدن اور اُس کے احیاء سے جو شدید ذہنی وابستگی تھی اُس کا اعتراف ان کے ایک مسلمان چیلے ڈاکٹر سید عابد حسین مدیر "الجامعہ" دہلی کو بھی کرنا پڑا وہ لکھتے ہیں:-

"اس میں شک نہیں مہاتما گاندھی ہندو آریائی تمدن کا احیاء چاہتے تھے لیکن ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ان کی جدوجہد، اُن کا خلوص، ان کا ایثار، اُن کی غریب دوستی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ہندو آریائی تمدن سے شدید وابستگی اور محبت کی وجہ سے وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اتنی کوشش نہیں کر سکے جتنی انہیں کرنے کا موقع تھا۔"[۴]

---

[۲] ہریجن ۸ر جون ۴۷ ۱۹ء بحوالہ وہی ص ۱۹۵

[۳] ینگ انڈیا ۶ر اکتوبر ۱۹۲۱ء بحوالہ وہی ص: ۱۹۶

[۴] ماہنامہ الجامعہ" دہلی جولائی ۱۹۳۶ء ص ۲۴۵

موتی لال نہرو

"یہ ایجی ٹیشن بالکل بے بنیاد ہے کہ میں ہندو نہیں۔ میں ایسا ہی ہندو ہوں جیسے خود پنڈت مالوی۔ میں ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ خود کانگرس ایک ہندو جماعت ہے اس میں ۲۱-۱۹۲۰ء میں تھوڑے سے مسلمان شامل ہو گئے تھے ورنہ ابتداء سے یہ ہندو جماعت ہے۔"[۵]

جواہر لال نہرو

اب ہندو قوم کے سب سے زیادہ معتدل مزاج رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی سنیئے:-

(و) "ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر دوسری قوم موجود ہے جو ایک جا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بالکل دوراز کار ہے۔ مسلم قومیت کے ذکر کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔ بس مذہبی رشتہ ہی ایک چیز ہے اس لئے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پا سکے۔"[۶]

(ب) "ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوستان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں یا دو قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دُنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں، آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی ہے۔"[۷]

(ج) "جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہیے اُسے ہندوستان میں دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت

---

[۵] اخبار "شیر پنجاب" لاہور ۱۹ر ستمبر ۱۹۲۲ء بحوالہ تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی تالیف منشی عبدالرحمن ص ۴۳

[۶] میری کہانی جلد دوم تالیف جواہر لال نہرو ص ۲۲۱ بحوالہ مسلمان اور سیاسی کشمکش از مولانا مودودی حصہ دوم بار سوم ص ۴۹

[۷] خطبہ صدارت آل انڈیا نیشنل کانفرنس از نہرو بحوالہ وہی ص ۷۸

کی ہے اور اُسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ قریب کے قریب
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ (مذہب) اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا،
بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ
اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کی بقا کا حامی
ہے۔" ۸؎

(د) "مسلم قوم کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے
اگر اخبارات اس کی قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس
سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت
سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا"۔ ۹؎

پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کے متذکرہ بالا بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے
مولانا مودودی لکھتے ہیں:۔

"جدید ہندی قومیت کا لیڈر وہ شخص ہے جو مذہب کا اعلانیہ مخالف ہے
ہر اُس قومیت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو۔ اُس نے اپنی
دہریت کو کبھی نہیں چھپایا یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان
رکھتا ہے۔ اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ میں دل اور دماغ
کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا اپنا
ہے اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں بلکہ مسلمانوں
کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو سیاسی
حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ
اور تہذیبی حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ

۸؎ میری کہانی تالیف جواہر لال نہرو بحوالہ سیاسی کشمکش حصہ دوم از مولانا مودودی بار سوم ص: ۸۸
۹؎ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۶

پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان
کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ
سکیں گے۔ مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب ان کے مستقل قومی
وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے۔ . . . .
ان سے کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے اور تمہاری تہذیب کی خصوصیات
بجز پاجامے اور داڑھی اور لوٹے کے اور ہے ہی کیا"۔ ۱۰؎

آزاد خیال ہندو رہنماؤں کے خیالات و بیانات آپ نے سُنے اب گاندھویت
(مولانا راغب احسن ایم کے الفاظ میں "جدید ہندی کفر") سے متاثر نیشنلسٹ رہنماؤں
رہنماؤں کے فرمودات بھی ملاحظہ کیجیے۔ کیوں کہ ان کے بغیر تصویر ادھوری رہے گی۔

مولانا عبید اللہ سندھی

آزاد خیال ہندو رہنماؤں کے خیالات و بیانات آپ نے دیکھے
اب "گاندھویت" (مولانا راغب احسن ایم اے کے الفاظ
میں جدید ہندی کفر) سے متاثر چند نیشنلسٹ مسلمانوں کے فرمودات عالیہ ملاحظہ کیجیے۔

عبید اللہ سندھی عام طور پر مجاہد آزادی، حریت پسند لیڈر اور مفکر اسلام
کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ اکبر کے دین الٰہی اور بھگتی تحریک سے بہت
زیادہ متاثر تھے۔ پھر گاندھویت کی پیروی نے سونے پر سہاگہ کا کام
کیا اور وہ دین اسلام کو ایسی شکل پر ڈھالنے کی کوشش کرنے لگے
جس سے وہ کانگریس کا جزو بن کر تمام ہندوستانیوں کے لیے قابل قبول
ہو سکے۔ اپنے ایک خط بنام ڈاکٹر جوتھو رام میں لکھتے ہیں:۔

۱۰؎ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اول تالیف مولانا مودودی بار چہارم ۱۹۴۲ء
ص ۱۸، ۱۹۔

"میرا یہ فیصلہ قطعی ہو گیا ہے کہ مجھے اسلام کی حفاظت کے لیئے ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کو نیشنل کانگرس کا جزو بنا دینا چاہیے۔ میری تحقیق میں ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت خصوصاً ادنیٰ طبقہ کے لوگ میری طرح ہندؤں کی اولاد ہیں۔ اُن کا قدرتی وطن اور ملک ہند کے سوا دوسرا ملک نہیں ہو سکتا اور جو بزرگ باہر سے آئے وہ بھی ہماری طرح ہند سے باہر اپنا کوئی ہمدرد نہ پائیں گے۔ انہیں بھی اپنی ملکی طاقت کے زور پر اپنا مذہب چلانا چاہیئے۔

اس لیئے کافی وقت صرف کر کے میں نے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی رہنمائی میں اسلامی تعلیمات پر نظر ثانی شروع کی۔ اس کو ایسا کر دیا۔ کہ ہندوستانی قومیت کے ساتھ جمع ہو سکے۔ تاکہ تمام ہندوستانی قوموں سے مذہبی جنگ ختم ہو سکے۔

میں نے اپنی قوم کی سائیکالوجی جانتے ہوئے اس پر اعتماد کیا ہے کہ جب ہم ہندوؤں پر ظلم کرنا چھوڑ دیں گے تو وہ کبھی ہم پر ظلم نہیں کریں گے۔ آج بھی مسلمانوں کے بعض بڑے بڑے لوگ ہندوؤں کے سیاسی غلبہ سے ڈر رہے ہیں، میرا جواب ان کے لیئے یہ ہے کہ شاید وہ پہلے ہندؤں پر زیادتی کر چکے ہیں اور اب بھی اس قسم کے کام مذہب کے نام سے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔" (١)

اوائل مارچ ۱۹۷۶ء میں حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کے مطب پر ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی کے ایڈیٹر اور مشہور فاضل علامہ عرشی امرتسری سے ملاقات

(١) نقوش لاہور مکاتیب نمبر ۱۰۹ حصہ اول ص ۴۲

ہوئی۔ تو مجاہدین حریت کا ذکر چھڑ گیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے ذکر کے سلسلہ میں جب میں نے انہیں مذکورہ بالا اقتباس سُنایا تو وہ کچھ دیر کے لیئے سناٹے میں آ گئے اور پھر بے ساختہ کہنے لگے "یہ الفاظ اور مولانا سندھی کے قلم سے"۔

پھر انہوں نے اس متذکرہ اقتباس کو فیض الاسلام کے مئی ۱۹۷۶ء کے پرچہ میں شائع بھی کیا اور اپنے قلم سے ایک نوٹ بھی لکھا۔ جو حسب ذیل ہے:۔

"یہ تاریخی سند مولانا ایک ہندو ڈاکٹر جو تھو رام کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔ کہ کسی ضرورت کے موقع پر گائے کے پجاری اور اسلام کے دشمن ہندو اس کو مسلمانوں کے منہ پر سخت تھپڑ کی طرح استعمال کریں۔ اسلام لانے کے باوجود اسلام کو ہندو کانگرس میں ضم یا جذب کر دینا چاہیئے۔ توبہ۔ توبہ عرشی" (٢)

ڈاکٹر سید محمود

(الف) "مسلمانوں نے اخلاقی، سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات، کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر ہندوستان کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے ولولۂ جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشوونما کرنا چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔ اپنی قسمتوں کو اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے وابستہ کر دیا۔" (٣)

(٢) ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی مئی ۱۹۷۶ء تاثرات ص ،

(٣) جامعہ اکتوبر ۱۹۲۳ء بحوالہ مسلمان اور سیاسی کشمکش تالیف مولانا مودودی مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ء بار چہارم ص ۹۷۔

(ب) "سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے۔ کیا ہم اس سمت میں قدم اٹھانے کو آمادہ ہیں۔ کہ ایک مشترک قومیت کی مع تمام لوازم کے تشکیل کریں۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے۔ جس میں ایک سے زیادہ اقوام بستی ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں۔ کہ ہر قوم علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند میں صرف انسانی اور مادی امداد کیا کرے۔ اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اس وقت تک کی کوششیں اس کے برعکس ناکام رہی ہیں لیکن اگر ہمارے اس سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پہ گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی۔ تب تو ہمیں عزم و استقلال کے ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیئے۔ بلکہ ہمارے پیشوں اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیئے۔ بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کے لیئے ایک مضرت ہے۔ لیکن اس کا کوئی چارۂ کار نہیں اور چوں کہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے۔ اس لیئے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کرنا چاہیئے۔" [14]

(ج) "ہندی کو زبان کے لیئے نہیں۔ بلکہ اہل ہند کے لیئے اختیار کرنا چاہیئے دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار

[14] بحوالہ وہی ص ۶۹

ہی دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہی ثابت کرتا ہے کہ ہم اس براعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں۔ اسی لیئے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں۔" [15]

سید سلیمان ندوی

سید سلیمان ندوی سابق رکن وصدر دارالمصنفین اعظم گڑھ کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو "قتیل شیوۂ آذری" تھے۔ اس دور میں ان کی اور اُن کے رفقاء کی تمام صلاحیتیں "گاندھویت" کے فروغ کے لیئے وقف تھیں۔

۳۔ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ کے "الانصاری" میں ان کا ایک بیان شائع ہوا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ "متحدہ قومیت" کا جادو اُن پر بھی چل چکا تھا۔ اس بیان میں انہوں نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو جس طرح طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:۔

"اس وقت تین ہی صورتیں ہیں یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھے رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں یا یہ کہ اپنا کیمپ الگ لگائیں (یہ مسلم لیگ کی طرف اشارہ ہے) اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوتِ بازو سے کب میدان جیتتی ہے اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرتی ہے۔ اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج (یعنی کانگرس) سے مالِ غنیمت میں جھگڑا کریں یا یہ کہ آزادی کی فوج میں شامل ہو کر آزادی

[15] بحوالہ وہی ص ۷۰، ۷۱

کے لیئے جنگ کریں اور اپنے لیئے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں۔" ۱۶؎

ندوی صاحب کے اس طنزیہ بیان پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

غور کیجئے کہ یہ ارشاد گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے۔ مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی جنگ سے الگ رہے اور اب ٹھٹکے کھڑے ہیں (مولانا مودودی صاحب کا یہ تجزیہ حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ مسلمان تو اس وقت ۱۹۳۷ء میں ایک فعال اور منظم جماعت کی حیثیت سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف تھے۔ سید نور محمد قادری) اس کی وجہ کچھ اور نہیں محض بزدلی ہے قوم بزدل ہونے کے ساتھ کمینی بھی ہے۔ جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی جو ظاہر ہے اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں شیروں کی طرح شکار مار لیں گے تو یہ (مسلمان قوم) جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح آکر حصہ بٹانے کی کوشش کرے گی۔ یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہن سامع میں بنتی ہے اور اس کے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ وہ شیران بیشۂ حریت ہیں جو تمام ہندوستان کی آزادی کے لیئے جنگ لڑ رہے ہیں اور پھر یہ جنگ آزادی کس قدر پاک، کیسی بے عیب اور

۱۶؎ "انصاری" دہلی ۳ رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے اس میں کسی لوث کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں۔ ایسی پاک جنگ، ایسے جہاد میں حصہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا۔ بس اب یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان بزدل، دوں ہمت اور کمینہ ہیں۔" ۱۷؎

ہندو اور قومیت کے علمبردار مسلم زعما کے مندرجہ بالا بیانات اس اصول کی وضاحت اور تبلیغ کر رہے ہیں۔ کہ "قومیں نسل۔ خون۔ زبان اور جغرافیہ کی بنیاد پر بنتی ہیں کہ نہ مذہب کی بنیاد پر" پھر عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا ملی تشخص اور دینی غیرت کو ختم کرنے کے لیئے جتنے یہ نادان مسلمان بے تاب نظر آتے ہیں اتنے ہندو نہیں۔ مولانا سندھی اور ڈاکٹر سید محمود کی تحریروں کے اقتباسات سے لکھنے والے کا نام تک حذف کر دیا جائے تو کوئی بھی یہ باور نہیں کرے گا کہ ان سطور کے لکھنے والے "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے پڑھنے والوں میں شامل ہیں یا وہ "ان الدین عند اللہ الاسلام" پر یقین کامل رکھتے ہیں۔

یہ ہے وہ فضا جو مولانا حسین احمد کے ارشاد "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" سے تیار ہو چکی تھی۔ اب مولانا نے اندازہ لگایا کہ لوگ اس نظریہ کو ذہنی طور پر تو قبول کر ہی چکے ہیں۔ کیوں نہ اسے ایک حتمی اصول کے طور پر پیش کر دیا جائے اور انہوں نے ایسا کر بھی دیا لیکن وہ "قوم رسول ہاشمی کی ترکیب" کو بھول گئے یہ کہ قوم نہایت ہی پست حالت میں بھی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبے سے خالی نہیں ہوتی اور وہ کسی حالت میں اپنے ملی تشخص اور روایات کو متحدہ قومیت کے سیلاب میں بہنے نہیں دے گی۔

۱۷؎ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم مرتبہ مولانا مودودی بار چہارم ۱۹۴۲ء ص ۱۰۰-۱۸۔

باب ۳

مولوی حسین احمد کے نظریہ پر

علامہ اقبالؒ کا شدید ردِّ عمل

مولوی حسین صاحب کے بیان سے متاثر ہونے والے علماء

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مولوی حسین احمد صاحب دیوبندی کے مذکورہ بیان "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" سے حضرت علامہ کو جو ذہنی و قلبی تکلیف ہوتی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولوی صاحب اپنے مکتبۂ فکر کے معمولی عالم نہ تھے بلکہ گلِ سرسبد تھے اور خطرہ تھا کہ مولوی صاحب کے نظریہ کو علمائے دیوبند من حیث الجماعت اپنالیں گے اور اس طرح مسلمان مزید مشکلات و الجھنوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔

حضرتِ علامہ کا یہ خیال اور خطرہ بالکل درست نکلا۔ دیوبندی علماء باستثنا تے چند مثلاً مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی اور مفتی محمد شفیع وغیرہم کانگرس کے ہم نوا اور مسلم لیگ کے جانی دشمن بن گئے یہاں تک کہ وہابی اور سنّی کی اصطلاحیں چل گئیں۔ وہابی کے اصطلاحی معنی کانگرس کا ہم نوا اور سنی کے مسلم لیگ کا طرفدار ہونے کے رہ گئے۔ اس کی توجیہ سیّد نذیر نیازی صاحب کی کتاب "اقبال کے حضور" میں اس طرح ملتی ہے۔

"یہ محض اتفاق ہے کہ لیگ جس متحدہ محاذ کی خواہاں تھی اس کے مخالفین کو وہابی اور اہلِ حدیث کہا جاتا ورنہ سوال اہل حدیث کا تھا نہ وہابیت کا۔ لیکن اختلاف اور انتشار کے اس تکلیف دہ زمانے میں جب مسلمان الگ الگ حلقوں میں بکھر گئے تھے بعض الفاظ نے اصطلاحات کی شکل اختیار کرلی تھی اور ان کا اطلاق صرف خاص خاص افراد یا حلقوں پر ہوتا، وہابیت یا دیوبند کا کانگرس کے طرف دار علماء اور ان کے عقیدت مندوں پر۔ مولانا حسین احمد کانگرس کے حامی تھے۔ مولوی ثناء اللہ

مرحوم مدیر "اہلِ حدیث" امرتسر بھی "ملکی مطلع" زیرِ عنوان جب سیاستِ حاضرہ پر تبصرہ فرماتے تو اس سے بھی کانگرس کی حمایت کا پہلو نکلتا۔ مولانا داؤد غزنوی کا شمار بھی زعمائے کانگرس میں ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام کو بھی اہلِ حدیث ہی کا رکنِ رکین تصور کیا جاتا ہے۔ انہیں بھی جماعت اہلِ حدیث کی تائید حاصل تھی۔ لہٰذا عام خیال یہ تھا کہ اہلِ حدیث یا عرفِ عام میں "وہابی" لیگ کے خلاف ہیں[1]

قادیان اور دیوبند کا سرچشمہ ایک ہے

حضرت علامہ نے فرمایا:۔

"قادیان اور دیوبند اگرچہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں اس تحریک کی پیداوار جسے عرفِ عام میں وہابیت کہا جاتا ہے۔"[2]

اس موقع پر کسی نے عرض کیا کہ چوں کہ اہلِ حدیث اقلیت میں ہیں اور اپنے عقائد میں بڑے متشدد لہٰذا یہ بھی کہا جاتا کہ وہ اپنے آپکو دوسرے مسلمانوں سے الگ رکھنا چاہتے ہیں انہیں ڈر ہے کہ سوادِ اعظم میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کانگرس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا:۔

"یہ امر تو اور بھی افسوسناک ہے عقائد میں تشدد، تعصب اور تنگ نظری اگر اسلام کے لیے ہے تو بڑی مبارک بات ہے۔ لیکن اگر اس لئے ہے کہ اہلِ حدیث سوادِ اعظم سے کٹ جائیں اور امت کی وحدت درہم برہم ہو جائے تو از حد قابلِ افسوس"[3]

۱ اقبال کے حضور تالیف سید نذیر نیازی مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء بار اول ۲۶۲ ، ۲۶۳

۲ ایضاً ص ۲۶۱

۳ ایضاً ص ۲۶۲

ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت علامہ نے کہا:۔

"اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اہلِ دیوبند حقائق سے آنکھیں بند کر لیں اور محض انگریز دشمنی، یا عقائد میں تشدد کے باعث مصالحِ امت کا لحاظ رکھیں نہ احکامِ شریعت کا۔ حالانکہ یہی حقائق ہیں جن کا فہم اور تشریح و توضیح ان کا سرمایۂ افتخار ہے۔ یہ کیسی انگریز دشمنی ہے کہ اُن کی مخالفت میں ہم اسلام کا پاس رکھیں نہ مسلمانوں کے مستقبل کا۔ بلکہ الٹا ان کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے کیا اسی کا نام وہابیت ہے مجھے معلوم نہ تھا وہابیت یہ کچھ ہے!"[4]

ایک اور موقع پر بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا:۔

"افسوس کہ مسلمانوں کی اکثریت کو حنفی قرار دیئے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ غیر حنفی کانگرس کی طرف جھک جائیں حالانکہ سوال نہ شیعیت کا ہے نہ حنفیت نہ وہابیت کا سوال فقط اسلام کا ہے۔"[5]

علامہ اقبالؒ کے چند لازوال اشعار اور اُن کا جواب

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی بات ہو رہی تھی کہ ایک عالمِ دین کی زبان سے "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کا نعرہ سُن کر حضرت علامہ کے حساس دل کو سخت تکلیف ہوئی اور آخر اس کسک اور اضطراب نے ایک لازوال شعری قطعہ کی شکل اختیار کر لی۔

۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء کی صبح کو سید نذیر نیازی صاحب حضرت علامہ کی

۴ وہی ص ۲۶۳

۵ وہی ص ۲۶۹

خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا نیازی صاحب تین شعر ہیں بیاض میں درج کر دو۔ نیازی صاحب نے عرض کیا ارشاد فرمایئے تو حضرت علامہ دردمند آواز سے گویا ہوئے۔ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است [6]

اس قطعہ کے علاوہ بھی اس موضوع پر علامہؒ نے کچھ اور اشعار کہے ہیں جو عام قارئین کی نظر سے اوجھل ہیں اُن کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہوں

؎ ندانی نکتۂ دینِ عرب را | کہ گوئی صبحِ روشن تیرہ شب را
اگر قوم از وطن بودے محمد | ندادے دعوتِ دیں بولہب را [7]

؎ حق را بغزہ بیدکہ نبی را بغزہ بید | آں شیخ فرما یہ کہ خود را مدنی خواند [8]

حضرت علامہ کے مذکورہ بالا اشعار جلد ہی اخبارات میں شائع ہوگئے ان کا چھپنا تھا کہ ہنگامہ برپا ہوگیا۔ حضرت علامہ کی ذات اور نظریات کے خلاف اور مولانا حسین احمد کی حمایت میں اخبارات و رسائل میں اُن کے حواریوں کی طرف سے مضامینِ نثر و نظم کے انبار لگ گئے۔ سید نذیر نیازی

---

[6] اقبال کے حضور تالیف سید نذیر نیازی مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء ص ۱۲۵، ۱۲۶

[7] وہی ص ۱۶۲

[8] وہی ص ۱۴۷

صاحب لکھتے ہیں :۔

"یہ قطعہ اشعار (سرود بر سر منبر الخ) ارمغانِ حجاز میں موجود ہے۔ اس کی اشاعت پر ہنگامہ برپا ہوگیا معترضین نے اس قطعہ پر قطعے لکھے۔ اخباروں میں مضامین شائع ہوئے۔ پمفلٹ چھاپے گئے۔ لیکن آج یہ سب یادیں محو ہو چکی ہیں نہ کسی کو قطعات کا علم ہے نہ مضامین اور پمفلٹوں کا۔ ان قطعوں اور پمفلٹوں میں کوئی جان تھی نہ روح۔ برعکس اس کے حضرت علامہ نے ایک حق بات کہی تھی اور حق اپنی جگہ پر آج بھی قائم ہے۔" [9]

---

[9] وہی ص ۱۲۶

باب چہارم

حضرت علامہ کے قطعہ اشعار کے جوابات

اور

مولانا کا باطل افروز بیان

دیوبندی ادیبوں کی طرف سے حضرت علامہ کے قطعہ اشعار کا جواب

حضرت علامہ کے اس قطعہ اشعار کے لکھنے والوں میں مشہور نقاد ڈاکٹر شوکت سبزواری، مولوی اقبال احمد سہیل اور مولوی شمس الحق افغانی سابق شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور وغیرہم شامل ہیں۔ مولوی اقبال احمد سہیل کی نظم بیس اشعار پر مشتمل تھی جو مکتوبات شیخ الاسلام مرتبہ مولوی نجم الدین اصلاحی جلد سوم میں مرتب کے مفصل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ پوری نظم مع مذکورہ نوٹ (NOTE) ملاحظہ فرمائیے:-

معاندے کہ بشیخ الحدیث خردہ گرفت　　سبک بخشم فروزیں سباب بے سببی است

بیان او ہمہ تخییل بحث در تفسیر　　زبانِ او عجمی و کلام در عربی است

کہ گفت بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است　　دروغ گوئی ایراد وایں چہ بوالعجبی است

درست گفت محدث کہ قوم از وطن است　　کہ مستفاد ز فرمودۂ خدا و نبی است

زبانِ طعن کشودی مگر نہ دانستی　　کہ فرقِ ملت و قوم از لطائفِ ادبی است

تفاوتے است فراواں میانِ ملت و قوم　　یکے زکیش و دگر کشور لعیت یا نسبی است

بملت از چہ براہیمی است سرورِ ما!　　ولے بہ قوم حجازی بہ نسل مطلبی است

ز قوم خویش شمرد اہل کفر را باحد　　رسولِ پاک کہ نامش محمد عربی است

خدائے گفت بقرآں لکل قوم ہاد　　مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است

بقوم خویش خطاب پیمبراں بہ نگر　　پر از حکایت اے قوم مصحف عربی است

بلند تر بود از قوم رتبۂ ملت　　کہ حبلِ دیں قوی تر ز رشتۂ نسبی است

کہ کہ ملتِ سلام نورِ سینۂ اوست	برادر است اگر زنگی است ور حلبی است
مگر بہ ہموطناں در جہادِ استخلاص	مجاہدانہ تعاون ز روئے حق طلبی است
سلوک برفق و مدارا بہ جار و ذی القربےٰ	عمل بہ حکمِ الٰہی و اتباعِ نبی است
محبتِ وطن است از شعائرِ ایماں	ہمیں حدیثِ پیمبر فدیتہٗ بابی است
نظر نہ بودن و بادیدہ و ور افتادن	دو گونہ شیوۂ بوجہلی است بولہبی است
رموزِ حکمتِ ایماں ز فلسفی جستن	تلاشِ لذتِ عرفاں ز بادہ عنبی است
خموشی از سخن ناسزا گزیدہ تراست	کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی و بے ادبی است
بہ دیوبند گزر گر نجات می طلبی	ز دیو نفس سلح شور و دانش توصبی است
نگیر راہِ حسین احمد از خدا خواہی !	کہ نائب است نبی را و ہم ز آل نبی است [1] ٭

اب مرتب مکتوبات مولوی نجم الدین اصلاحی صاحب کا نوٹ بھی ملاحظہ کریں۔

"ہم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں کیوں کہ ہم نے اُن کے کلام کو بغور پڑھا ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مرحوم کے جہاں سینکڑوں اشعار اور ہزاروں اشعار مفید ہیں وہیں اُن کے کتنے اشعار ایسے ہیں جن کے کھلے بندوں اسلام اور اسلامی فلسفہ پر اس کی زد پڑتی ہے اگر "در زمانہ حال ہیں اقوام اوطان سے بنتی ہیں،" یا "متحدہ قومیت" کا نظریہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اسلام کے مطابق نہ تھا تو اس سے کہیں زیادہ ہوئی گمراہی کی تبلیغ

[1] مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی مطبوعہ دیوبند بار سوم ۱۹۶۶ء ص ۱۴۲، ۱۴۳

٭ اس نظم کو بڑے اہتمام سے "الرشید" کے "مدنی و اقبال نمبر" کے صفحہ ۳۳۶ پر بھی "اقوام بنام اقبال" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔" (سید نور محمد قادری)

بڑے فلسفی کہے جا رہے ہیں لیکن جہاں تک شاعری اور وہ بھی اُردو فارسی شاعری کا درجہ ہے سہیل صاحب کا مقام اُن سے بہت زیادہ بلند ہے۔" [1]

اصلاحی صاحب کے نوٹ اور سہیل صاحب کی پوری نظم درج کرنے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ پوری نظم مع نوٹ اس سے پہلے بہت کم قارئین کی نظر سے گزری ہوگی۔ دوسرے یہ کہ نظم اور اصلاحی صاحب کا نوٹ محض دو افراد (سہیل اور اصلاحی) کی رائے اور خیال نہیں بلکہ پورے حلقۂ دیوبند کی صدائے بازگشت ہے۔ اور اس سے وہ بغض جو علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ارباب حلقۂ دیوبند کے سینوں میں چھپا ہوا ہے اظہر من الشمس ہو جاتا ہے۔

سہیل صاحب کی اس مذکورہ نظم پر ماہنامہ "حقیقتِ اسلام" لاہور کے ایڈیٹر نے اُسی زمانہ میں بڑا دلچسپ اور ایمان افروز تبصرہ کیا تھا۔ ایک اقتباس درج ہے :۔

"جو لوگ متحدہ قومیت میں جذب ہونا چاہتے ہیں اور اس کا پرچار بھی دن رات کرتے رہتے ہیں۔ ان میں یہ نہ سمجھیے کہ محض مغربی جادو کا شکار نوجوان ہی ہیں جو نئی تعلیم کے فیض سے یورپ سے آئی ہوئی ہر چیز کو اچھا سمجھنے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اشتراکیت وغیرہ کو پسند کرنے کے جذبہ کے طفیل مسلم لیگ کی مخالفت کر رہے ہیں بلکہ قہر تو یہ ہے کہ اس صف میں چند علماء بھی پیش پیش ہیں جو وارثانِ دینِ نبوی کہلاتے ہیں۔ ہم ان بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ یہ کیا اندھیر ہے کہ ایک طرف ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ :۔

[1] وہی ص ۱۴۱، ۱۴۲

موصوف کے اس شعر میں کیا موجود نہیں ہے۔ ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں !

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پاکستان میں قانون سازی کا اُصول فکرِ اقبال کی روشنی میں تو ہو سکتا ہے، کیوں کہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے وہ مرحوم ہی کے فلسفہ کا دوسرا نام ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم اکابرِ اولیاء اسلام کے دوش بدوش بلکہ مع شیٔ زائد رتبہ دے دیا جائے، تو پھر بھی کم ہے۔ مگر ہم ہندی طالب علموں کے نزدیک تو ڈاکٹر صاحب کا وہی مقام ہے جو علامہ اقبال احمد سہیل مرحوم کا ہے یہ اور بات ہے کہ آخر الذکر وکالت کی نذر ہو کر رہ گئے اور اول الذکر پنجاب کی نبوت خیز زمین کی بدولت آج شارح اور مفکر اسلام وغیرہ کے ناموں سے یاد کئے جا رہے ہیں۔ یو۔ پی جو ہندوستان اور پاکستان کا قلب ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب مرحوم اس سرزمین میں پیدا ہوئے ہوتے اور یہیں اُن کا نشو و ارتقاء ہوا ہوتا تو شاید رموز و اسرارِ شریعت کے ساتھ اُن کو "اگر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی" کا حکیمانہ مصراع فراموش نہ ہوتا اور نہ وہ آخر میں رجوع فرماتے بلکہ یا تو خاموش رہتے یا براہِ راست مولانا مدنی سے پوچھ کر وہ کرتے جس کے وہ اہل تھے بہر کیف "ما صفی لا یعود" ارمغانِ حجاز سے جب وہ اشعار نہیں نکالے گئے تو مجبوراً ہم کو بھی یہ حق بداہت حاصل ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اشعار کے جو جوابات دیئے گئے تھے اب الگ شائع کر دیں۔ یہاں پر صرف علامہ اقبال صاحب سہیل مرحوم اعظم گڈھ کے ان اشعار کو شائع کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کے اندر نہ صرف شاعری بلکہ ڈاکٹر صاحب کو تعلیم بھی دے دی گئی ہے۔ اہلِ دیانت خود ہی انصاف فرمائیں گے، مانا کہ ڈاکٹر صاحب بہت

؏ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

مگر اس کے مقابلے میں ایک شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ

؏ برو براہِ حسین احمد از خدا خواہی

یعنی اگر تجھے خدا چاہیے تو حسین احمد کی راہ پر چل اگر مقابلہ میں حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس نام نہ لیا گیا ہوتا جس کے مقدس قدم کی خاک کا تاج بھی اگر حسین احمد کو میسر آ جائے تو بھی وہ حسین احمد ہو سکتا ہے تو شاید یہ کہنا برداشت بھی کر لیا ہوتا مگر اب اسے برداشت وہی شخص کر سکتا ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں، غور کیجئے اگر اس طرح کا تقابل کوئی غیر مسلم کرتا تو مسلمان کتنے بھڑکتے مگر خود مسلمان اور خصوصاً ان کے پیشواؤں پر سب راہیں کشادہ ہیں جو چاہیں کریں؟ [۱۲]

اب مولوی شمس الحق افغانی صاحب سابق شیخ التفسیر جامعۂ اسلامیہ بہاولپور کے چند اشعار سنئے یہ اشعار پڑھ کر ایک حساس قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان اشعار کے خالق کو سرکاری یونیورسٹی جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شیخ التفسیر کی کرسی پر کیسے اور کیوں بٹھایا گیا اور پھر پاکستان میں صرف ایک یہی مثال نہیں بلکہ اور بے شمار لوگوں کو سونے چاندی میں تولا گیا جو سرے سے دو قومی نظریہ کے ہی مخالف تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی اس عقیدہ پر قائم رہے کہ پاکستان محض جغرافیائی مجبوریوں کی بنا پر ظہور میں آیا ہے۔ مثلاً غلام رسول مہر اور جناب مشتاق احمد صاحب سابق آڈیٹر جنرل پاکستان۔ مولانا مہر جو مورخِ پاکستان اور شارحِ اقبال کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اپنے ایک مضمون "پاکستان کے چند بنیادی مسائل" میں لکھتے ہیں:-

"یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھ لینی چاہیے کہ تقسیم کے جو خط شمال مغرب اور شمال مشرق میں کھینچے گئے تھے وہ جغرافیائی خط تھے یعنی دونوں جانب زمین کے معین ٹکڑوں کو الگ الگ کیا گیا تھا۔ مسلموں اور

۱۲؎ ماہنامہ "حقیقتِ اسلام" لاہور دس سالہ نمبر ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء ص ۴۴

غیر مسلموں کے گروہوں کو الگ الگ نہ کیا گیا تھا۔ پھر دو قوموں کا نظریہ کہاں سے پیدا ہُوا یا اس سے وہ مفہوم پیدا کرنے کی کیا دلیل ہے جسے دو قوموں کے نظریے کے سلسلے میں پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کی بنیاد قومی نہیں جغرافیائی تھی۔" [۱۳]

جناب مشتاق وجدی صاحب سابق آڈیٹر جنرل پاکستان کی خود نوشت "ہنگاموں میں زندگی" نہایت ہی نفیس کاغذ، کتابت اور طباعت کے ساتھ فیروز سنز کیطرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے صفحات ۱۲۶ تا ۱۳۹ پر فاضل مصنف نے مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کے خلاف بھی بھر کر زہر اگلا ہے۔ کسی کا مصرع ہے :۔

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اس کے مصداق یہی شیخ التفسیر مولانا شمس الحق افغانی، مولانا مہر اور مشتاق وجدی صاحب جیسے حضرات ہی ہیں جو تمام عمر مسلم لیگ، اُس کے قائد اور نظریۂ پاکستان کے خلاف کام بھی کرتے رہے اور اعلیٰ عہدوں پر متمکن بھی رہے، دولتِ خداداد کے پیسے سے عیش بھی کرتے رہے اور جی بھر کر اسے کوستے بھی رہے۔ اب بھی خُدا جانے کتنے لوگ ہوں گے جو نظریۂ پاکستان حضرت قائد اور حضرت علامہ کے نظریات کے سخت مخالف بھی ہوں گے اور حکومت کی آنکھوں کا تارا بھی بنے ہوں گے۔ اُمید ہے کہ پاکستان کے موجودہ نیک دل صدر جناب ضیاء الحق صاحب ادھر بھی توجہ فرمائیں گے اور ان کالی بھیڑوں سے پاکستان کو نجات دلائیں گے۔ خیر یہ تو تھا جملہ معترضہ، اب مولانا افغانی کی زہر افشانی ملاحظہ کیجئے۔ حضرت علامہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :۔

"نظامِ قوم بدو گونہ می شود پیدا — اگر ہنوز ندانی کمال بولہبی است
نظامِ ملت واحد باختلافِ بلاد — قوام گیر ز جذبِ محمد عربی است
نظامِ دوم کہ قائم میانِ صد ملت است — نظامِ وحدتِ ملکی ست ایں چہ بوالعجبی است" [۱۴]

[۱۳] روزنامہ "امروز" لاہور دس سالہ نمبر ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء ص ۴۲
[۱۴] ماہنامہ "الرشید" ساہیوال "مدنی و اقبال نمبر" ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۶ء ص ۲۴۷

یہاں ایک اور بھی کا اندراج بھی خالی از افادہ نہ ہوگا جو "حضرت سید مدنی اور ڈاکٹر اقبال" کے عنوان سے الرشید ساہیوال کے "مدنی اور اقبال نمبر" میں بڑے اہتمام سے شائع کی گئی ہے :۔ نظم کے خالق ہیں سید محمد اظہار الحق سہیل عباسی امروہوی۔ ملاحظہ ہو۔

علومِ آں مدنی مادہ اسے مکتبی است — یگانہ ہست بدھر و مکارمش وہبی است
نگفت حضرتِ الشاں کہ "ملت از وطن است — پس اتہامِ بشیخ الحدیث بے ادبی است
بہر شنیدہ مدہ گوش پرس پرساں نیز — بہر شنیدہ زدن چانہ شانِ بولہبی است
میانِ شیخ و خورت داوری مکن اقبال — کہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
ہنوز او عجمی ہست و کاشمیری تو — مدینہ مسکنِ او ہست و سید نسبی است
رموزِ دیں و بداند سخن در ہندی — حسین احمد تحریر نے؟ چہ بوالعجبی است
نگفت حافظ شیراز گو سفندے ہست — خمیرِ شاعرِ ہندی اسارت ادبی است
سہیل شانِ حسین احمد است بس بالا — ز شعر ہائے اقبال ایں چہ بوالعجبی است [۱۵]

مولوی حسین احمد کا اجمل افروز بیان حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ بالا قطعہ اور اس تائید و تردید میں لکھی ہوئی تحریروں سے جب مولانا حسین احمد صاحب کا رہا سہا بھرم بھی کھلنے لگا تو ان کے ایک دیوبندی عقیدت مند مولوی عبدالرشید نسیم طالوت [۱۶] نے اُن کو

[۱۵] وہی ص : ۲۷۸ [۱۶] طالوت صاحب کوئی غیر جانب دار شخصیت نہیں تھے بلکہ مولوی صاحب کے ہم نوا و ہم پیالہ تھے اور خود بھی وطنی قومیت کے معتقد و معترف، سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں :۔

"مولانا حسین احمد کے طرفدار تھے قوم اور وطن کی بحث میں اکثر اخباروں میں کوئی نہ کوئی مضمون لکھتے رہتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مولانا حسین احمد کا موقف یہ نہیں کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں بلکہ یہ کہ بحالتِ موجودہ جو بھی قوم ہے اسکی اساس قومیت جغرافیائی ہے یا وطنی"

(اقبال کے حضور تالیف سید نذیر نیازی ص : ۳۰۷)

بذریعہ خط لکھتا کہ بڑے میاں ہوش کے ناخن لو کس الجھن میں پھنستے جا رہے ہو کوئی ایسی تحریر کسی نہ کسی بہانے شائع کر دیا کر وا دو جس سے اس جھاڑ کے کانٹے سے تمہاری گلو خلاصی ہو سکے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے طالوت صاحب ایک مفصل خط لکھا جو "متحدہ قومیت اور اسلام" مطبوعہ لاہور کے نو صفحات ۳ تا گیارہ پر پھیلا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے مذکورہ خط ۸ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ / ۹ فروری ۱۹۳۸ء کو لکھا اور طالوت صاحب کو بھیجنے کے علاوہ ہم خیال احباب کے مشورہ کر کے مختلف اخبارات و رسائل مثلاً "مدینہ" "الجمعیت" "انصاری" "ہند جدید" "پاسبان" اور "ترجمانِ سرحد" وغیرہ کو اشاعت کے لیے جاری کر دیا۔

جب یہ مفصل اور طویل خط طالوت صاحب کو ملا، تو انہوں نے اس سے مفید مطلب اقتباسات نقل کر کے مع اپنے خط کے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کر دیئے تاکہ مولوی صاحب کی پوزیشن کو صاف کیا جا سکے۔ لیکن طالوت صاحب کے مرسلہ اقتباسات کے پہنچنے سے پہلے مولوی صاحب کا مفصل خط پریس میں آ چکا تھا جو حضرت علامہ اور اُن کے احباب کی نظر سے گزر چکا تھا۔

مولوی صاحب نے اس خط یا بیان میں اپنے فرمودہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کی مولویانہ تاویلیں کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ میرے الفاظ کا وہ مطلب یا مفہوم نہیں جو علامہ اقبال سمجھے ہیں، فرماتے ہیں: ۔

"۸ یا ۹ جنوری کے "انصاری" اور "تیج" ملاحظہ فرمائیے میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ مذہب و ملت کا دار و مدار وطنیت پر ہے یہ بالکل افترا اور دجل ہے "احسان" مورخہ ۳۱ جنوری کے صفحہ ۳ پر بھی میرا یہ قول یہ نہیں بتایا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے اگرچہ یہ بھی غلط ہے۔ مگر یہ ضرور تسلیم کیا گیا ہے کہ مذہب اور ملت کا دارومدار وطنیت پر ہونا میں نے نہیں کہا تھا،

شملہ کی چوٹیوں اور نئی دہلی سے تعلق رکھنے والے ایسے افترا، اور اتہام کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس قسم کی تعریفیں اور سب و شتم اُن کے فرائضِ منصبیہ میں سے ہیں مگر سر اقبال جیسے مہذب متین شخص کا اُن کی صف میں آ جانا ضرور تعجب خیز امر ہے۔ اُن سے میری خط و کتابت نہیں۔ مجھ سے ادنیٰ ترین ہندوستانی کا ان کی بارگاہِ عالی تک پہنچنا اگر امرِ محال نہیں تو مشکل ضرور ہے اگر غیر مناسب نہ ہو تو اُن کی عالی بارگاہ میں یہ شعر ضرور پہنچائیے۔ ؎

هنيئاً مريئاً غير داء مخامر ۞ لعزة من اعراضنا ما استحلت

افسوس کہ سمجھ دار اور آپ جیسے عالی خیال تو یہ جانتے ہیں کہ مخالفت کی بنا پر یہ اخبار ہر قسم کی ناجائز اور ناسزا کارروائیاں کرتے رہتے ہیں، ان پر ہرگز اعتماد ایسے امور میں نہ کرنا چاہئے اور سر اقبال موصوف جیسے عالی خیال حوصلہ مند، مذہب میں ڈوبے ہوئے تجربہ کار شخص کو یہ خیال نہ آیا نہ تحقیق کرنے کی توجہ فرمائی۔ آیۃ "ان جاءکم فاسق بنبإ فتبينوا الخ" گویا نظر سے نہیں گزری۔ سر اقبال فرماتے ہیں: ؎

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است

کیا انتہائی تعجب کی بات نہیں کہ ملت اور قوم کو سر اقبال ایک قرار دیکر ملت کو وطنیت کی بنا پر نہ ہونے کی وجہ سے قومیت کو بھی اس سے منزہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بوالعجبی نہیں تو کیا ہے۔ زبانِ عربی اور مقامِ محمد عربی علیہ السلام سے کون بے خبر ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں لفظ "قومیت" کا کہا ہے، "ملت" کا نہیں، دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ملت کے معنی شریعت یا دین کے ہیں اور قوم کے معنی عورتوں اور مردوں کی جماعت کے ہیں"۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں دو خاص مولویانہ حربے استعمال کئے گئے ہیں ایک تو مسئلہ

[1] متحدہ قومیت اور اسلام تالیف مولوی حسین احمد مطبوعہ لاہور ص ۵ ، ۶

کو الجھانے کے لئے ملّت اور قوم کی بے سود نئی بحث چھیڑ دی ہے اور دوسرے اپنے خاص انداز میں حکیم الامّت علامہ اقبال پر چوٹیں کی ہیں تو کہیں شملہ کی چوٹیوں اور نئی دہلی سے تعلق رکھنے والوں میں شمار کیا ہے اور کہیں انہیں عربی زبان اور مقام محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے بے خبر ہونے کا طعنہ دیا ہے۔

اب ذیل میں مذکورہ خط کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں جو طالوت صاحب نے اپنے خط بنام حضرت علامہ شامل میں نہیں کیا۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی سکیم اور ان کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اس اقتباس میں بلی اپنے تھیلے سے بالکل باہر آگئی ہے۔ مولوی صاحب نے کھل کر متحدہ قومیت کی وکالت کی ہے۔ اور دعویٰ کیا ہے کہ مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لئے رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے نہیں۔

اب اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ طالوت صاحب کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں :۔

"میرے محترم اس اجنبی اور خود غرض حکومت اور پردیسی خون چوسنے والی قوم نے جس قعرِ مذلّت اور ہلاکت اور قحط و افلاس کے تیرہ و تاریک گڑھے میں تمام ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً عرصۂ دراز سے ڈال رکھا ہے اور جس طرح وہ ہندوستانیوں کو روز افزوں فنا کے گھاٹ اُتارتی جا رہی ہے وہ اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے، نیز اس سے آزاد ہونا اور ملک و ملت کی زندگی اور بہبودی کی فکر اور سعی کرنا ہر حیثیت سے سبھوں کا فریضہ ہونا بھی اظہر من الشمس ہے، اگرچہ اس پردیسی خونخوار قوم سے نجات کے اور ذرائع بھی عقلاً ممکن ہیں مگر جس قدر اور مؤثر ذریعہ تمام ہندوستانیوں کا متفق اور متحد ہو جانا ہے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے اس کے آگے حکومت کے جملہ اسلحہ اور تمام قوتیں بیکار ہیں اور بغیر نقصانِ عظیم ہندوستانی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ

ملک کو منظم کیا جائے اور اُن کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لئے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے نہیں جس کی اساس محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگرس نے ابتداء ہی سے اس امر کو اپنے اغراض و مقاصد میں داخل کیا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب کانگرس کا اجلاس ہوا تو سب سے پہلا مقصد مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔

"ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب ہے اُن سب کو متفق اور متحد کر کے ایک قوم بنایا جائے۔" [۱۸]

---

[۱۸] ایضاً ص ۱۰۸

باب ۵

حضرت علامہ کا باطل شکن مقالہ

مولوی صاحب کے مذکورہ بیان کے چھپنے سے پہلے ہی حضرت علامہ اگرچہ ایک ایسا مدلل مضمون لکھنے کے لئے ذہناً تیار تھے جس میں مولوی صاحب اور اُن کے حاشیہ برداروں کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات اور اُن کے ذہنی مغالطوں کا مفصل اور مکمل جواب دیا جائے۔ اس بیان نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ایسا کرنا ناگزیر ہوگیا حضرت علامہ کی اُن دنوں کی ذہنی کیفیت کو سیّد نذیر نیازی صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"حضرت علامہ کو دکھ اس بات کا ہے کہ مولانا حسین احمد کو اپنی غلطی پر اصرار ہے اور اب انہوں نے اپنے اس ارشاد کے علاوہ کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں ایک نیا نظریہ قائم کرلیا ہے وہ یہ کہ اسلام میں قوم اور ملت دو الگ الگ وجود ہیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا اب تو مضمون لکھنا ضروری ہوگیا ہے"[1]

حضرت علامہ نے مزید فرمایا :-

"یہ سیاست کا چکر بھی عجیب ہے، انگریزوں کی ضد میں کس طرح تلبیسِ حق بالباطل سے کام لیا جارہا ہے۔ مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے، مسلمان کیوں نہیں سمجھتے۔ اسلام کی اجتماعی روح کیا ہے، وہ عالم اور صوفی کیا ہوئے جو دین کے رمز شناس تھے، کیسے کیسے الفاظ ہیں جو لوگوں کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ قوم، متحدہ قومیت، وطن، وطنیت، آزادی خود اختیاری

---

[1] اقبال کے حضور تالیف سید نذیر نیازی کراچی ص ۲۲

لیکن کوئی نہیں سمجھتا آجکل کی سیاست میں ان کے کیا معنی ہیں،
الفاظ کے معنوں کا متعین ہو جانا ضروری ہے۔ ان کا تجزیہ بھی ہونا
چاہیئے۔ یہ الفاظ عام ہو رہے ہیں ضرورت ہے ان کو سمجھنے کی،
لیکن مسلمانوں کو احساس ہی نہیں انہیں کس قسم کی جدوجہد درپیش
ہے، از روئے سیاست ہی نہیں اخلاقاً اور ذہناً بھی، کاش
مسلمان کوئی سیاسی فکر پیدا کریں۔" ۲؎

ان دنوں حضرت علامہ کو مسلمان عوام کی روش سے عموماً اور کانگرس علما کی
غیر اسلامی روش سے خصوصاً ذہنی تکلیف تھی وہ ہمہ وقت اضطرابی کیفیت میں
رہتے۔ سید نذیر نیازی صاحب نے اُن کی اس کیفیت اور اضطراب کو حضرت
علامہ کے ایک مخلص اور جان نثار عقیدت مند کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے۔

"حضرت علامہ سوتے سوتے اکثر اُٹھ بیٹھتے ہیں کہتے ہیں،
مسلمانوں کو کیا ہو گیا جو لوگ دین کے راز دار تھے وہ دین سے
بے خبر ہیں۔ وہ بھی کہنے لگے ہیں "قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" ۳؎

چونکہ ان دنوں متحدہ قومیت اور اسلامی قومیت ہی کا مسئلہ تھا جس پر
اکثر حضرت علامہ اور ان کے قریبی دوستوں اور ہم جلیسوں میں گفتگو رہتی۔ ایک
دفعہ متحدہ قومیت کے تصور پر بحث کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"یہ تصور سر تا سر کفر ہے۔ مگر افسوس ہے مولانا ہر روز ایک
نئی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ اب وہ لغت کا سہارا لے رہے ہیں۔
قوم اور ملت میں فرق کریں حالانکہ یہ مسئلہ لغت کا نہیں قرآن

۲؎ ایضاً ص ۲۱۰
۳؎ ایضاً ص ۲۱۷

پاک کی تعلیمات کا ہے۔" ۴؎

مزید فرمایا:۔

"مولانا کو چاہیئے لغت کا سہارا نہ ڈھونڈھیں، انہیں
چاہیئے اس امر پر نظر رکھیں کہ قرآن پاک نے اگر کسی لفظ کو
اصطلاحاً استعمال کیا ہے تو کن معنوں میں، یہ نہیں کہ خود اپنی
طرف سے اس کا معنی و مفہوم متعین کرنے کی کوشش کریں،
مولانا اور اُن کے حامیوں کا یہ خیال بہر صورت غلط ہے، کہ
قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ وطن بھی قومیت کی کوئی مستقل
اساس نہیں ہے۔" ۵؎

حضرت علامہ کو جدید تعلیم سے آراستہ اور افرنگ زدہ طبقہ سے بہتری
کی بہت کم امیدیں تھیں۔ اُن کی احیاءِ اسلام کی امنگیں اور آرزوئیں تو سراسر
علماءِ اسلام سے وابستہ تھیں۔ لیکن وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ
افرنگ زدہ طبقہ تو کسی حد تک اسلام کے قریب آ رہا ہے۔ لیکن گاندھویت
کے مارے ہوئے علمائے اسلام سے بہت دور جا رہے ہیں۔ اپنی اس ذہنی
خلش کو انہوں نے یوں بیان کیا ہے:۔

"یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کوٹ اور پتلون کے مقابلے میں جسے
گویا دہریت کی علامت سمجھا جاتا تھا اب سیاست اور تمدن
کے وہ فرنگی تصورات جو اسلام کی ضد ہیں جبہ اور دستار میں
پناہ لے رہے ہیں۔" ۶؎

۴؎ ایضاً ص ۲۲۰
۵؎ ایضاً ص ۲۲۰، ۲۲۱
۶؎ ایضاً ص ۲۴۷

اس ارشاد کی مزید وضاحت فرماتے ہیں :-

"مسلمانوں میں ایک افرنگ زدہ طبقہ پیدا ہوگیا ہے۔ بظاہر
اب یہی طبقہ اسلام کی طرف لوٹ رہا ہے۔" [۷]

یہ ہے حضرت علامہ کے اُس دَور کی ذہنی کیفیت اور اپنی اضطراب کا اجمالی خاکہ۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہتے ہیں وہ سید نذیر نیازی صاحب کی بے مثل تالیف "اقبال کے حضور" کا ٹھنڈے دل و دماغ سے مطالعہ فرمائیں۔

حضرت علامہ کا باطل شکن مقالہ

پہلے واضح ہوچکا ہے کہ حضرت علامہ "متحدہ قومیت" کے موضوع پر ایک مفصل مقالہ لکھنا چاہتے تھے اور مولانا کے مذکورہ بالا بیان کے بعد اس کا لکھا جانا ازحد ضروری ہوگیا تھا۔ اس کا ذکر نیازی صاحب نے اپنی کتاب میں اس طرح کیا ہے۔

"فرمایا۔ کیا مضمون ضرور ہونا چاہیے۔
میں نے عرض کیا۔ ضرور اور آپ ہی کی طرف سے
فرمایا۔ کیوں
میں نے کہا۔ اس لئے کہ کانگرسی خیال کے علماء الحاد اور بے دینی کی جس دعوت کو دانستہ یا نادانستہ تقویت پہنچا رہے ہیں وہ روز بروز ترقی پر ہے۔ میں اُن کے نظریات سے خوب واقف ہوں۔ پڑھا لکھا طبقہ تو خیر قرآن و حدیث سے دُور ہٹ چکا ہے، اور سمجھتا ہے وطنی قومیت سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہے۔ رہے عوام سو ان میں کانگرسی علماء کے زیر اثر اب یہ

[۷] ایضاً ص ۲۴۷

یہ تحریک پھیل رہی ہے کہ وطنی قومیت کو اسلام کی تائید حاصل ہے۔ غیر کانگرسی علماء میں کون ہے جو انہیں سمجھائے کہ جن سیاسی اور اجتماعی حقائق کے پیش نظر یہ تحریک پھیلائی جا رہی ہے۔ اس کی صحیح نوعیت کیا ہے اور بطور ایک نظام مدنیت اسلام کی تعلیمات کیا۔ اگر آپ بھی خاموش رہے تو ان مغالطوں کا ازالہ کیسے ہوگا۔ جو اس باب میں پیدا ہوچکے ہیں۔ کانگرسی خیال اخبارات کو دیکھ لیجئے۔ مولانا حسین احمد کی حمایت میں کس طرح مضمون پر مضمون لکھا جا رہا ہے۔ آپ کا یہ مضمون شائع ہوگیا تو مجھے یقین ہے ویسا ہی مؤثر ثابت ہوگا جیسے اسلام اور احمدیت۔" [۸]

سید نذیر نیازی صاحب ہی کی نہیں۔ بلکہ حضرت علامہ کے دوسرے دوستوں مثلاً چوہدری محمد حسین اور میاں محمد شفیع صاحب (م۔ ش) کی بھی یہی رائے تھی۔ کہ حضرت علامہ بنفسِ نفیس مولوی صاحب کے بیان کا جواب لکھیں۔ چنانچہ ان مخلص دوستوں کے اصرار اور دینِ مصطفےٰ کے تحفظ کے جذبہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے ادھر توجہ فرمائی ہے اور ایک مضمون "جغرافیائی حدود اور مسلمان" لکھا جو اخبار "احسان"، لاہور کی ۹۔ مارچ ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں چھپا۔ اس مضمون نے نسلی اور جغرافیائی قومیت کے حامیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی اور ان کے ریت کے بنائے ہوئے محل مسمار ہوگئے۔ اس مضمون کی مقبولیت کا یہ عالم تھا۔ کہ "احسان" کے علاوہ دو قومی نظریہ کے حامی دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی نقل ہوا۔

اس مضمون کے شائع ہونے کے چند ہی ماہ بعد بمبئی سے بابائے قوم کے

[۸] ایضاً ص ۱۳۱۔

سوانح عمری بعنوان "محمد علی" شائع ہوئی تو اس مضمون کو اس کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر کتاب میں پورے کا پورا شامل کر لیا گیا۔ یہ مضمون نصف صدی گزرنے کے باوجود آتنا ہی اہم اور ایمان افروز ہے جتنا کہ اس وقت تھا۔ اب ہم ذیل میں اس جامع، بلیغ اور بصیرت افروز مضمون کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہو گا کہ اس مردِ حق آگاہ اور عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کانگرسی ذہن کے عالم مولوی حسین احمد صاحب کے پادر ہوا نظریات، خیالات اور اعتراضات کا کس جامعیت کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیا ہے۔

ملاحظہ ہو:۔

(الف) "میں نے اپنے مصرعہ

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است

میں لفظ ملت قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں شرع اور دین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن حال کی عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم ملت بمعنی قوم ہی استعمال کیا ہے۔ لیکن چونکہ لفظ ملت کے معنی زیرِ بحث مسائل پر چنداں مؤثر نہیں۔ اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر میں تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد کا ارشاد یہ تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔ مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ کہا جاتے کہ زمانۂ حال میں اقوام کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا

جائے کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں۔ ایسے مشورے سے قومیت کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کا ایک اہم دینی پہلو ہے جس کی تنقید ایک مسلمان کے لیئے ازبس ضروری ہے۔ افسوس کہ میرے اعتراض سے مولانا کو یہ شبہ ہوا کہ مجھے کسی سیاسی جماعت کا پراپیگنڈہ مقصود ہے۔ حاشا وکلا میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں، جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداء ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی۔ کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں۔ کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیئے اس سے بہتر اور حربہ نہیں۔ کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانہ کا الٹ پھیر بھی عجیب ہے۔ ایک وقت تھا نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان "تفرنج" میں گرفتار تھے۔ اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریئے ان کے لیئے جاذبِ نظر ہیں مگر افسوس ؎

زنہ گردد کعبہ را رختِ حیات

گر ز فرنگ آیدش لات و منات "[9]

(ب) سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم | "میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ

[9] محمد علی جناح تالیف عبدالعزیز بی۔ اے، بی سی مطبوعہ بمبئی ص ۴۴ تا ۴۶

ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی اور ایرانی وغیرہ۔ وطن جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے۔ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ اور ہیں کل کچھ اور۔ کل تک اہلِ برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیئے قربانی کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ جس کی پرورش کے لیئے اثبات کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں۔ بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اس لیئے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔" [۱۰]

۱۰؎ ایضاً ص ۴۶، ۴۷۔

(ج) مولانا حسین احمد کا نظریۂ وطنیت

مگر جو فتنہ مولانا حسین احمد کے ارشاد میں پوشیدہ ہے۔ وہ زیادہ دقتِ نظر کا محتاج ہے۔ اس لیئے میں امید کرتا ہوں کہ قارئین مندرجہ سطور کو غور سے پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ مولانا حسین احمد عالمِ دین ہیں۔ اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے امتِ محمدیہ کے لیئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے لفظ قوم استعمال کیا ہے یا لفظ ملت۔ ہر اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا جو ان کے تصور میں امتِ محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوسناک امر ہے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ہے۔ لیکن احساس ان کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا۔ انہوں نے لفظی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ ملت اور قوم کے لغوی فرق اور امتیاز سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ ملت کو قوم سے ممتاز قرار دینا ان لوگوں کی تشفی کا باعث تو ہو سکے جو دینِ اسلام کے حقائق سے ناواقف ہیں۔ واقف کار لوگوں کو یہ قول دھوکا نہیں دے سکتا۔" [۱۱]

(د) مولانا کی زمین و آسمان

"مولانا نے بظاہر یہ کہہ کر کہ میں نے لفظ ملت اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیا۔ میں ملت کو وطنی قوم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دونوں میں زمین و

۱۱؎ ایضاً ص ۵۰، ۵۱۔

آسمان کا فرق ہے۔ گویا اگر قوم زمین ہے تو ملت بمنزلہ آسمان ہے۔
لیکن معناً اور عملاً آپ نے ملت کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں چھوڑی
اور آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ وعظ فرما دیا ہے کہ ملک و سیاست کے اعتبار
سے اکثریت میں جذب ہو جاؤ۔ قوم قومیت کو آسمان بناؤ دین فطرت
زمین بنتا ہے تو بننے دو۔ مولانا نے یہ فرض کر کے مجھے قوم اور ملت کے
معنی میں فرق معلوم نہیں۔ اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا
کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی وہاں قاموس کی ورق گردانی
بھی نہ کر سکا۔ مجھے زبانِ عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ
سر آنکھوں پر۔ لیکن کیا اچھا ہوتا اگر میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین
کی خاطر قاموس سے گزر کر قرآن حکیم کی طرف مولانا رجوع کر لیتے۔
اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے
سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ وحی سے بھی استشہاد فرماتے مجھے
تسلیم ہے کہ میں عالمِ دین نہیں۔ نہ عربی زبان کا ادیب۔ ؎

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا۔[۱۲]

(۵) دنیا میں دو ہی ملتیں ہیں ایک اسلام ایک کفر — "عہد حاضر کے ہندوستان
کے علماء کو حالاتِ زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں
کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جو قرآن یا نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہرگز

[۱۲] ایضاً ص ۵۱، ۵۲۔

نہ ہو سکتی تھی۔ کون نہیں جانتا۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے پہلے
پیغمبر تھے۔ جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطن کو بالائے طاق رکھا گیا۔
بنی نوع آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی موحد و مشرک۔ اس وقت سے
لے کر دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں۔ تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ
آج دعوتِ ابراہیمی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور قومیت کی ردا اوڑھنے
والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی
بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں (باپ، بیٹا) نے کی "واذا
یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل۔ ربنا تقبل
منا انک انت السمیع العلیم۔ ربنا واجعلنا مسلمین لک
ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک" کیا خدا کی بارگاہ سے امت مسلمہ
کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعیہ
کا کوئی حصہ عربی، ایرانی، افغانی، مصری یا مصری قومیت میں جذب
ہو سکتا ہے۔ امت مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے
اور وہ "الکفر ملۃ واحدہ" کی ہے۔ امتِ مسلمہ جس دین
فطرت کی حامل ہے اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دین قیم کے الفاظ میں
ایک عجیب و غریب لطیفۂ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف
دین ہی مقوم ہے۔ اس گروہ کے امور معاشی اور معادی کا جو اپنی
انفرادی اور اجتماعی زندگی اس نظام کے سپرد کرے۔ بالفاظ دیگر یہ
کہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دین اسلام
ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس
حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامقبول

ونامراد ہے۔ ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لیئے قابلِ غور ہے کہ اگر " وطنیت " کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دل جوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریشِ مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس آپ (یعنی مولانا حسین احمد) اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اسلام دینِ قیم، امتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی ان کو چھوڑ دیا۔ ان کو کسی دوسری سیاسی ہیئتِ اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابولہب امتِ مسلمہ ہی کو آزادی سے پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت ان سے نزاع پیش آئی۔ محمد صلی اللہ علیہ کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک ونسب اب ملک ونسب ان کا گرفتار ہو گیا۔

کے کو پنجہ زد ملک ونسب را

نہ داند نکتۂ دینِ عرب را

اگر قوم از وطن بودے محمد

نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را "۔ [۱۳]

(و) مولانا اور قادیانی افکار کا تتبع

" حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت کا نظریۂ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین ومتشکل کر چکا ہے۔ کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے بظاہر نظریۂ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی انکارِ خاتمیت۔ الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے۔ لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے۔ جس کی توضیح صرف اُسی وقت ہو سکے گی۔ جب کوئی دقیق النظر مسلمان ہندی مسلمانوں اور بالخصوص اُن کے بظاہر متعدد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا "۔ [۱۴]

---

[۱۳] ایضاً ص ۵۶ تا ۵۸۔

[۱۴] ایضاً ص ۶۱۔

(ز) نبوتِ محمدیہ کا نصب العین

مد نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے۔ کہ

ایک ہئیتِ انسانیہ اجتماعیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کرنے کے ان کو تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے۔ جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی۔ یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے یہ راہ بہت آسان تھی۔ کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے۔ ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ لیکن نبی آخر الزمان کی راہ نہ ہوتی۔" [۱۵]

حضرت علامہ کے اس فکر انگیز اور ایمان افروز مضمون کے زیادہ اقتباسات پیش کرنے کی اس لیئے ضرورت پیش آئی کہ اس مضمون میں انہوں نے رائج الوقت سیاسی اصطلاحوں مثلاً قوم، متحدہ قومیت، وطن، وطنیت، آزادی اور خود اختیاری

۱۵ء ایضاً ص ۵۸۔

پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بھرپور نظر ڈالی ہے اور پھر اس مضمون کے اندراجات آئندہ کے لیئے مسلمان قوم کا دستور العمل بنے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اس مضمون کا دقیق نظروں سے مطالعہ کریں۔ تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ کانگرسی علماء کے پھیلائے ہوئے انتشار اور غلط نظریات کا اثر زائل کرنے کے لیئے یہ مضمون کس قدر مفید اور کارگر ثابت ہوا۔

باب ۶

مولانا طالوت کی تدلیس اور حضرت علامہ کا رجوعی بیان

طالوت اور حضرت علامہ کی خط و کتابت

طالوت صاحب کے فہمائشی خط کے جواب میں مولوی حسین احمد صاحب نے جو طویل خط لکھا۔ اس میں بجائے اعترافِ حقیقت ودور از کار تاویلوں سے کام لے کر نئے مسائل چھیڑ دیئے۔ یہ خط مولوی صاحب نے ۸، ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ بمطابق ۹، فروری ۱۹۳۸ء کو لکھا اور اپنے ہم مسلک اخبارات و رسائل کو اشاعت کے لیئے جاری کر دیا۔ لیکن اس امر (یعنی اشاعت) کی اطلاع طالوت صاحب کو نہ دی۔ یہ خط جب طالوت صاحب کو ملا تو انہوں نے اس میں سے اپنے مطلب کے اقتباسات تیار کر کے حضرت علامہ کو ارسال کر دیئے۔ حالانکہ دیانت داری کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ پورے بیان کی نقل حضرت علامہ کو ارسال کرتے۔ لیکن اس ان کی نام نہاد غیر جانب داری کا بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ تھا۔ ان اقتباسات کے ہمراہ طالوت صاحب نے حضرت علامہ کو ایک خط بھی ارسال کیا جس میں لکھتے ہیں :-

"یہ مولانا کی تقریر کے وہ اقتباس ہیں جو میرے نزدیک ضروری تھے کہ وہ آپ کی نظر سے گزر جائیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ مولانا کی پوزیشن صاف ہے اور آپ کی نظم کی اساس غلط پراپیگنڈے پر ہے۔ آپ کے نزدیک بھی اگر مولانا بے تصور ہوں تو مہربانی فرما کر اپنی عالی ظرفی کی بناء پر اخبارات میں ان کی پوزیشن صاف فرمایئے۔ بصورت دیگر مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمایئے تاکہ مولانا سے مزید تشفی کر لی جائے۔ ہمارے جیسے نیاز مند دو گونہ رنج و عذاب میں مبتلا ہیں"[۱]

[۱] متحدہ قومیت اور اسلام تالیف مولوی حسین احمد مطبوعہ لاہور ص ۱۴، ۱۵۔

طالوت صاحب اگر رنج وعذاب میں مبتلا تھے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ دونوں حضرات یعنی حضرت علامہ اور مولوی صاحب کے عقیدت کیش تھے۔ بلکہ اس وجہ سے تھے کہ ان کے ہیرو کی پوزیشن خراب سے خراب تر ہو رہی تھی اور وہ اسے سہارا دینے چاہتے تھے۔

غرض اس خط کے جواب میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹، فروری ۱۹۳۸ء کو طالوت صاحب کو ایک خط لکھا جو درج ذیل ہے۔

"جناب من!

________ مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے۔ ان میں سے بعض میں تو اصل معاملہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مگر بعض نے معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور مولوی صاحب کے خط کے اقتباسات درج ہیں۔ اس واسطے میں نے آپ ہی کے خط کو جواب کے لیے انتخاب کیا ہے جواب انشاء اللہ اخبار "احسان" میں شائع ہو گا۔ میں فرداً فرداً علالت کی وجہ سے خط لکھنے سے قاصر ہوں۔

فقط

مخلص محمد اقبال" [5]

مندرجہ بالا خط لکھنے کے چند ہی دنوں بعد حضرت علامہ نے طالوت صاحب کو

---

[5] ایضاً ص ۱۶۔

کو ایک اور خط اس اُمید میں لکھا کہ شاید مولوی صاحب راہ راست پر آجائیں۔ کیوں کہ مولوی صاحب سے لڑائی پورے دیوبند (باستثنائے چند) سے لڑائی تھی اور پھر حضرت علامہ کو مولوی صاحب سے کوئی ذاتی رنجش یا پرخاش نہیں تھی صرف نظریاتی اختلاف تھا۔ لیکن اختلاف اتنا شدید تھا کہ کفر اور اسلام کی جنگ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جیسا کہ ہم "اقبال کے حضور" سے ایک اقتباس سے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت علامہ "متحدہ قومیت" کے نظریہ کو سراسر کفر سمجھتے تھے۔

اب حضرت علامہ کا یہ دوسرا خط بھی ملاحظہ ہو۔

"جناب من!

سلام مسنون

________ میں حسب وعدہ آپ کے خط کو جواب "احسان" میں لکھوانے کو تھا کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی جس کو گوش گزار کر دینا ضروری ہے۔ اُمید ہے کہ آپ مولوی صاحب کو خط لکھنے کی زحمت گوارا فرما کر اس بات کو صاف کر دیں گے۔

جو اقتباسات آپ نے ان کے خط کے درج کیے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اگر ان کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ فرنگی سیاست کا نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ البتہ اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کر لیں تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی۔ اس خیال سے کہ بحث تلخ اور طویل نہ ہوتے

پاتے۔ اس بات کا صاف ہونا ضروری ہے کہ مولانا کا مقصود ان الفاظ سے کیا تھا۔ ان کا جو جواب آئے وہ آپ مجھے روانہ کر دیجئے۔ مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلایئے کہ میں ان کے احترام میں کسی اور مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں۔ البتہ اگر مذکورہ بالا الفاظ سے ان کا مقصود وہی ہے جو میں نے اوپر لکھا ہے تو میں ان کے مشورے کو اپنے ایمان اور دیانت کی رو سے اسلام کی روح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف جانتا ہوں۔ میرے نزدیک ایسا مشورہ مولوی صاحب کے شایانِ شان نہیں۔ اور مسلمانانِ ہند کی گمراہی کا باعث ہوگا۔ اگر مولوی صاحب نے میری تحریریں کو پڑھنے کی کبھی تکلیف گوارا کی ہے تو انہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں نے اپنی عمر کا نصف اسلامی قومیت اور ملت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح میں گزارا ہے۔ محض اسی وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیئے اور خصوصاً اسلام کے لیئے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرۂ عظیم محسوس ہوتا تھا۔ کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈہ کرنا نہ میرا اس سے پہلے مقصد تھا، نہ آج مقصود ہے۔ بلکہ وہ شخص جو دین کو سیاسی پروپیگنڈے کا پردہ بناتا ہے۔ میرے نزدیک لعنتی ہے۔

مخلص

محمد اقبال[ف۳]،،

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس خط کے موصول ہونے کے بعد طالوت صاحب

ف۳ متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۱۷، ۱۸۔

نے مولوی حسین احمد صاحب کو خط لکھا اور مولوی صاحب نے ان کے خط کا جواب دیا وہ "متحدہ قومیت اور اسلام" مطبوعہ لاہور کے صفحات ۱۹ تا ۲۲ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس خط میں احساس ندامت اور اعترافِ حقیقت تو کسی حد تک اوپرے دل سے کہا گیا ہے (یعنی محض بات کو ٹالنے کے لیئے) لیکن خط کے آخر میں مسلم لیگ اور حضرت علامہ کے خلاف دل کے پھپھولے خوب نکالی گئی ہے۔ مولوی صاحب کا ارشاد ہے۔

"کس قدر تعجب خیز امر ہے کہ قوم اور ملت اور دین کو ایک قرار دیا گیا۔ میں فرق نقل کر چکا ہوں۔ اگر خلافِ لغت سر صاحب موصوف (حضرت علامہ کے لیئے مولوی صاحب نے ہر جگہ سر کا لفظ طنزاً استعمال کیا ہے) کا نظریہ دونوں کے اتحاد وغیرہ کا ہے۔ تو ان کو اپنے نظریئے کے مخالف کو ایسے ناشائستہ الفاظ کہنے کا کیا حق تھا۔ بہرحال ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی

جواب تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا!

...... مسلم لیگ کی شرمناک کارروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب سے میں علیحدہ[ف۵] ہوا ہوں ہر قسم کے سب و شتم کا بہ نسبت سابق نشانہ بنا ہوں۔ وہ کون سے الفاظ و معاملات ہیں جو نہیں کیئے گئے۔ سر صاحب موصوف تو جب بھی غیر ہیں۔ یہاں اپنے کیا کمی کر رہے ہیں[ف۴]"

جب اس خط کی نقل طالوت صاحب کی معرفت حضرت علامہ کو پہنچی۔ تو انہوں

ف۵ مولوی صاحب مسلم لیگ سے کیوں اور کیسے علیحدہ ہوئے۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں

ف۴ متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۲۱، ۲۲

نے سمجھا کہ شاید مولوی صاحب راہِ راست پر آ رہے ہیں تو انہوں نے اپنا رجوعی بیان ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کے "احسان" کے پرچے میں شائع کروایا۔ لیکن حضرت علامہ کی مومنانہ بصیرت دیکھئے کہ اپنے اس بیان کو بھی انہوں نے اس شرط کے ساتھ مشروط رکھا کہ "اگر مولوی حسین احمد صاحب نے اپنے ارشاد "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" کا ذکر محض برسبیل تذکرہ کیا ہو لیکن اگر انہوں نے مسلمانوں کو اس نظریہ کے اپنانے کا مشورہ دیا ہو تو مجھے اس پر اعتراض ہے۔

اب حضرت علامہ کے اس رجوعی بیان کا مکمل متن ملاحظہ ہو۔

"جناب ایڈیٹر صاحب "احسان" لاہور

السلام علیکم۔ میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد صاحب کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں اس امر کی تصریح کر دی گئی کہ اگر مولانا کا یہ ارشاد کہ "زمانہ حال میں اقوام اوطان سے بنتی ہیں" محض برسبیل تذکرہ ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اور اگر مولانا نے مسلمانانِ ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریہ وطنیت کا اختیار کریں تو دینی پہلو سے اس پر مجھ کو اعتراض ہے۔ مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار "انصاری" میں شائع ہوا، مندرجہ ذیل الفاظ ہیں۔

لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتہ اتحاد بجز متحدہ قومیت اور کوئی رشتہ نہیں۔ جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔"

ان الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانانِ ہندوستان کو مشورہ دیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار "احسان" میں شائع ہوا ہے۔ لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا جس کی ایک نقل انہوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے۔ اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:۔

"میرے محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیانِ واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں۔ اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلافِ دیانت ہے۔ اس لیئے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سباق پر نظر ڈالی جائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ خبر ہے انشاء نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں کیا پھر اس مشورے کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے۔"

خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنہوں نے ایک دینی امر کے توضیح کے صلہ میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں۔ خدا ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔"؎

؎ متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۲۳، ۲۴۔

یہ ہے حضرت علامہ کے مشروط مرجوعی بیان کا مکمل متن جسے مولوی حسین احمد کے متبعین ۔ توبہ نامہ ،، اور معافی نامہ سے تعبیر کرتے ہیں ۔ یہ بیان ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کے ،، احسان ،، میں چھپا تھا ۔ اگر اس تاریخ کے بعد مولوی صاحب کی طرف ،، متحدہ قومیت ،، کی وکالت کا سلسلہ ختم ہو جاتا اور وہ نئے سرے سے اس باطل نظریے کی حمایت و تبلیغ کے لیئے کمر بستہ نہ ہو جاتے ۔ تو حضرت علامہ کے اس بیان کو توبہ نامہ کہا جاتا یا معافی نامہ کوئی فرق نہ پڑتا تھا ۔ لیکن بدقسمتی سے بات یہ ہے کہ مولوی صاحب نے اپنے ہم مسلک احباب کے اصرار سے اس ایمان سوز نظریہ کی بھرپور حمایت و تبلیغ حضرت علامہ کے بیان کے بعد از سر نو شروع کر دی ۔ جس کی تفصیل آئندہ باب میں ملاحظہ کریں ۔

باب ۷

بلّی تھیلے سے باہر آگئی

مولانا "متحدہ قومیت" کے مبلغ اور ترجمان کی حیثیت میں

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بیان کے بعد مولوی حسین احمد صاحب کی جدت پسند طبع میں ایک نیا ولولہ ابھرا اور انہوں نے ایک مضمون بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" لکھنا شروع کر دیا۔ جو چند ماہ بعد مجلس قاسم العلوم دیوبند کی طرف سے شائع ہوا۔

مولوی صاحب نے ابھی اس نئے مضمون کے چند صفحات ہی لکھے تھے۔ کہ وہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جس کا ذکر مولوی صاحب نے اپنے مضمون میں بھی کیا ہے۔ حضرت علامہ کی وفات کا مولوی صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ ہر طرف اور ہر لحاظ سے بے نیاز ہو کر باطل کی حمایت میں زیادہ دیدہ دلیر ہو گئے اور مضمون میں جہاں کہیں حضرت علامہ کا ذکر آیا وہاں انہوں نے متانت و تہذیب سے گری ہوئی زبان استعمال کی ہے۔ حضرت علامہ کے بارے میں مولوی صاحب کی گلفشانی ملاحظہ ہو۔

"یہ امر یقینی اور ناقابلِ انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے۔ وہ آسمانِ حکمت و فلسفہ، شعر و سخن، تحریر و تقریر، دل و دماغ اور دیگر کمالات کے درخشندہ آفتاب تھے۔ مگر باوجود کمالاتِ گوناگوں ساحرِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ ؎

گاہ باشد کودکِ ناداں ٭ بغلط بر ہدف زند تیرے"[1]

---

[1] متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ قومی ایکتا ٹرسٹ نئی دہلی ص ۷۔

اپنے اس مضمون میں مولوی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ "نظریہ متحدہ قومیت" نہ صرف میرا مشورہ ہے بلکہ میں اسے ہندوستانی مسلمانوں کے لیئے ضروری سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب کے نظریے اور اُن کی ذہنیت کو سمجھنے کے لیئے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

الف۔ ڈاکٹر صاحب کا آخری بیان جس میں مرحوم نے اس بحث کو ختم کر دینے کا اعلان فرمایا ہے نظر سے گزرا۔

"حسین احمد نے اپنے بعض احباب کے خط میں اقرار کیا ہے کہ میرا مقصد دہلی کے بیان میں اخبار تھا انشاء نہ تھا۔ یعنی یہ مقصد تھا کہ فی زمانا لوگ وطنیت کو قومیت کا ذریعہ بتاتے ہیں اس کی خبر دی جائے اور یہ امر واقعی ہے کہ یورپین اقوام اور ان کے فلاسفر عرصے سے اسی پر گامزن ہیں۔ اسی لیئے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ مختصراً"

اس بیان سے اگرچہ دہلی کی تقریر کے متعلق ہیجان رفع ہو گیا۔ مگر نفسِ مسئلہ اور اس کے لیئے اس جد و جہد اور عملی جامہ پہنانے کی سعی کے متعلق جو کہ نہ صرف میرا مشورہ ہی ہے۔ بلکہ میں موجودہ احوال و ادوار میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیئے ضروری سمجھتا ہوں ہیجان اور بڑھ گیا یعنی مولانا صاحب کے اعترافِ حقیقت اور احساس ندامت کے بعد ان کے ہم مسلک احباب نے مولوی صاحب سے کہا کہ میاں تم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ ؎

پہلے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت
پر شب کی منتوں نے کھو دی رہی سہی

میں نے ۹ ذی الحجہ کے بیان میں اس کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔ اگرچہ دہلی کی تقریر میں اس کی ترغیب بالکل نہ تھی۔ اس لیئے ضروری معلوم ہوا کہ اس کے متعلق اپنی ناچیز رائے ملک کے سامنے پیش کروں اور اُن غلطیوں کا ازالہ کر دوں۔ جو اس قسم کی "قومیتِ متحدہ" سے ممانعت اور اس کو خلاف دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہل ہندوستان سے بنا بر "وطنیت" اس اتحادِ قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جد و جہد عمل میں لا رہی ہے اور اس کی مخالف قومیں اس کے غیر قابلِ قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لا رہی ہیں۔"[۲]

ب۔ "جس طرح جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کو میرے بعض احباب کے خطوط کے جواب سے معلوم ہوا۔ دہلی کی تقریر میں مشورہ دینا مقصود نہ تھا۔ اور نہ کوئی لفظ اس کا ذکر کہا گیا تھا۔ میں اس تقریر میں ان نقصاناتِ عظیمہ کو بیان کر رہا تھا جو کہ انگریزی حکومت سے تمام ہندوستانیوں کو اور بالخصوص مسلمانوں کو پہنچے ہیں۔ ان ہی میں سے یہ امر بھی ہے کہ چونکہ فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس لیئے تمام باشندگانِ ہند خواہ مسلمان ہوں یا ہندو، سکھ ہوں یا پارسی بیرونی تمام ملکوں میں نہایت ذلیل شمار ہوتے ہیں ان کی عزت اور قدرت ایک غلام کی عزت سے زیادہ نہیں۔ نہایت ہی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کی باتوں اور مطالبات کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے

[۲] ایضاً ص ۵۔

سب ایک ہی شمار ہوتے ہیں۔ . . . . . . برطانیہ کے ازلی وفاداروں کو کب ایسی بات کا تحمل ہو سکتا تھا۔ انہوں نے رائی کو پہاڑ دیا۔ بہرحال شاید اسی میں کچھ خیر ہو۔ اس حیثیت سے یقیناً بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے مگر دوسری حیثیت سے کہ جناب ڈاکٹر صاحب موصوف مسلمانانِ ہند کو قومیت متحدہ کا مشورہ دینا خلافِ دیانت سمجھتے ہیں اور یہ امر چونکہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے اس لیئے مجھ کو کچھ عرض کرنا ضروری ہے"[۳]

ج۔ "ہندوستان میں سکونت کرنے والی قومیں اور افراد بحیثیت وطن و مسکن بہت سی ایسی چیزوں میں مشترک ہیں۔ جن کو موجودہ پردیسی حکومت نے اپنی اغراض کے ماتحت پامال کر دیا ہے اور ہندوستان کے باشندوں کی زندگی تلخ کر دی ہے۔ بلکہ تمام ہندوستان کے رہنے والوں کے لیئے فنا کا گھاٹ سامنے کر دیا ہے۔ اس لیے تمام ہندوستانی متفق ہو کر ان ضائع شدہ حقوق کو حاصل کریں۔ ان کے لیے متحدہ جد و جہد ہو۔ یہ مقصد متحدہ قومیت سے ہے۔ جس کا رابطہ اتحاد "وطنیت" ہے۔ ایسے مقاصد کے لیئے متحدہ قومیت غیر مسلموں کے ساتھ بنانا خود سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے۔"[۴]

یہاں مولوی صاحب نے اس معاہدہ کا سہارا لیا ہے جو تاریخ اسلام میں "معاہدۂ یثرب" کے نام سے معروف ہے۔ یہ معاہدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین، انصار اور یہودانِ مدینہ کے درمیان باہمی امن و صلح کے لیئے مرتب فرمایا

[۳] ایضاً ص ۷، ۸

[۴] ایضاً ص ۴۱

تھا در محمد رسول اللہ " کے مصنف مولانا محمد رضا انصاری مصری نے اس معاہدہ کا مکمل متن سیرت ابن اسحٰق سے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ جس کا ترجمہ چند سال ہوئے تاج کمپنی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب نے اس معاہدہ سے اپنے مفید مطلب چند اقتباسات یا دوسرے لفظوں میں چند دفعات درج کی ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ یہ تمام معاہد جماعتیں (انصار، مہاجرین، یہود) دوسری غیر مسلم غیر معاہد جماعتوں کے مقابلہ میں ایک جماعت اور قوم شمار ہوں گی۔

۲۔ جن یہود نے ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی مدد اور ان کے ساتھ مواسات کا برتاؤ کریں ان کے ساتھ کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے اور نہ ان کے خلاف کسی ظالم کی مدد کی جائے۔

۳۔ یہود بنی عوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں۔ یہود اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے۔ مذہب کے سوا باقی امور میں مسلمان اور یہود بنی عوف ایک جماعت شمار ہوں گے۔" ۵؎

لیکن انہوں وہ دفعات چھوڑ دیں۔ جو ان کے مقصود سے ٹکراتی تھیں۔

مثلاً:۔

۱۔ جب تم میں اس دستاویز کے متعلق کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اس صورت میں اللہ اور اس کے رسول سے رجوع کیا جائے۔ یہودی جب تک مسلمانوں کے ساتھ مل کر کفار سے جنگ کرتے رہیں گے تو وہ مسلمانوں کے ساتھ متحد شمار ہوں گے۔" ۶؎

۵؎ ایضاً ص ۴۳، ۴۴

۶؎ محمد رسول اللہ تالیف محمد رضا انصاری مطبوعہ تاج کمپنی ص ۱۵۹۔

۲۔ نہ کوئی یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر مدینہ سے باہر نہ جا سکے گا اور نہ وہ کسی زخمی و مقتول کے قصاص میں حائل ہو گا۔" ۷؎

ان دونوں دفعات کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اختیارات کی مرکزیت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور طے پایا تھا کہ جب بھی اس معاہدہ کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف پیدا ہو تو صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا جائے یعنی آخری اور حتمی فیصلہ یہودیوں کی بجائے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کوئی یہودی مدینہ سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ جب تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے باہر جانے کے کے مقاصد وعزائم کی تحقیق نہ کر لیں وہ باہر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ تھیں اس معاہدہ یثرب کی خاص اور مرکزی دفعات۔

اب مولانا ہندوستان میں جو "متحدہ قومیت" قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے مرکزی اختیارات مسٹر گاندھی کے پاس تھے نہ کہ مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد کے پاس اور مسٹر گاندھی اپنی اکثریت کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو بھی چاہتے، کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی سے اس دور کے اکثر عالم بجائے بندۂ اسلام بننے کے بندۂ گاندھی بن کر رہ گئے تھے۔

۹۔ "متحدہ قومیت کا جذبہ جو کہ ان مختلف مذاہب ہندیہ میں بجز وطنیت کسی اور ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا، پیدا ہونا اور نہایت قوت کے ساتھ پیدا ہونا ازبس ضروری ہے تاکہ جملہ اقوام ہندیہ دوش بدوش ہو کر جنگ آزادی کریں اور اپنے لیے زندگی اور بہبودی کی صورتیں پیدا کریں۔" ۸؎

۸؎ متحدہ قومیت اور اسلام تالیف مولوی حسین احمد مطبوعہ ص ۵۹، ۶۰۔

مولوی صاحب کے اس مقالہ کی تان بھی حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ذکر پر ٹوٹی ہے اور اپنے مولویانہ انداز میں انہوں نے جو گوہر بیزی کی ہے۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:۔

"ہم اپنی تحریر کو اس فلسفیانہ تقریر اور شاعرانہ تخیل کے جوابات سے طویل اور دراز کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ جو جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے فلاسفری دماغ سے تراش کر کے ذکر فرمائی ہے۔ مقاصد اصلیہ کو ہم نے واضح کر دیا ہے وہ تقریر (یعنی حضرت علامہ کی) یونانی یا یورپی فلسفہ اور اسی کی زبان ہے۔ جس کی طرف خود جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم توجہ کرنا خلاف دیانت سمجھتے ہیں۔" [ف۸]

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی صاحب ہندوستانی مسلمانوں کو جدید نظریہ وطنیت کو نہ صرف اپنانے کا مشورہ دے رہے ہیں بلکہ اس نظریہ کو مسلمانوں کی جملہ تکالیف و مصائب کا آخری علاج بھی سمجھتے ہیں اور پھر اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے حضرت علامہ کے اس شعر کے مصداق

[ف] خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

قرآن و حدیث کی من مانی تاویلیں بھی کرتے ہیں اور پھر بات اس مقالہ پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اپنی حیاتِ مستعار کے آخری لمحہ تک وہ "متحدہ قومیت" کے غیر اسلامی نظریہ کے مبلغ و مؤید رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے چند ماہ بعد مولانا کا ایک مضمون بعنوان "مسائل حاضرہ اور اس کے نتائج پر ایک مدبرانہ تبصرہ" ماہنامہ "نئی زندگی" دہلی کے

ف۹ ایضاً ص ،،

جولائی کے شمارہ میں شائع ہوا جس میں انہوں نے متحدہ قومیت کی تبلیغ اور مسلم قومیت کی مخالفت میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ "جمعیۃ العلماء ہند نے کبھی بھی دو قومی نظریہ کی حمایت نہیں کی۔ نہ اس کے بدترین نتائج یعنی تقسیم ہند کی تائید کی۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس کو غیر فطری اور ملت کے لیے تباہ کن تصور کرتی رہی۔ البتہ مختلف فرقوں کے مذہبی اور بعض معاشرتی حقوق و مفادات کی حفاظت کو جمعیۃ علماء ہند نے ہمیشہ ضروری سمجھا اور اسی بنا پر وہ پاکستان کی باقاعدہ تجویز سے پہلے ایک فارمولا مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کر چکی تھی۔"

(ایضاً ص ۱۸)

۲۔ کانگرس کے مطالبہ پاکستان کو مان لینے کے بارے میں مولانا کے قلم کی جولانی ملاحظہ ہو:۔

"انڈین نیشنل کانگرس نے بھی اپنی عظیم الشان تاریخ میں اس غلطی کا ارتکاب کیا جس کے لیے زعماء دل سے آمادہ نہ تھے اور زبانیں اعتراف کر رہی تھیں کہ ہم غلط راستہ پر چل رہے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند نے کانگرس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور اس نے اجلاس لکھنؤ میں کانگرس کی اس عجیب و غریب غلطی سے بے زاری کا اعلان کیا مگر افسوس زمام اختیار ان کے ہاتھ میں تھی جو تقسیم ہند کا فیصلہ کر چکے تھے۔"

(ص ۲۰)

اللہ اللہ مولانا کی اسلام دشمنی گاندھی اور نہرو تو مسلمانانِ ہند کے متفقہ فیصلہ کو طوعاً و کرہاً تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر مولانا کے کفر دوست دل کی پکار "افسوس زمام اختیار ان کے ہاتھ میں تھی جو تقسیم ہند کا فیصلہ کر چکے تھے" کے الفاظ میں ڈھل

گئی۔

مولانا حسین احمد صاحب کی سیاسی اور دینی زندگی کی تاریخ بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی سے ملتی جاتی ہے۔ جس طرح مولانا آزاد شروع میں "مسلم قومیت" کے زبردست حامی تھے۔ اسی طرح مولانا حسین احمد صاحب بھی اجلاس امروہہ (اس اجلاس میں جمعیت العلماء ہند نے کانگرس کا دم چھلا بننے کا فیصلہ کیا) سے پہلے متحدہ قومیت کے مخالفوں میں سرفہرست تھے۔ اجلاس امروہہ سے تھوڑی مدت پہلے انہوں نے مولانا شوکت علی کو ایک مفصل خط لکھا جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اس وقت وہ ہندوؤں کے ساتھ متحدہ قومیت بنانے کے مخالف تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ دو عظیم اور صاحب فضل ہستیاں مسٹر گاندھی اور جواہر لال نہرو کے دام ہمرنگ زمیں میں اس طرح گرفتار ہوئیں کہ ان کی بہترین صلاحیتیں بجائے مسلم مفاد کے ہندو مفاد کے لیئے ہو کر رہ گئیں۔

مولانا کے مذکورہ خط کے صرف دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ "میں آں جناب کی توجہ ایک خاص طریقہ پر اور ایک حقیقت نفس الامری کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی کامل ہمارا مذہبی، سیاسی اور وطنی نصب العین ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ ہم اپنے مذہب اور قوم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ آزادی کو بھی مذہب اور قوم کی وجہ سے ڈھونڈتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مذہب برباد ہو جائے۔ اور مسلمان فنا ہو جائیں تو ایسی آزادی سے کیا فائدہ ہے۔ چونکہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں اور اکثریت بھی غیر معمولی ہے۔ یعنی تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ ڈاکٹر مونجے صاحب بھی یہ فرما رہے ہیں کہ "یہ سرزمین کسی مسلمان یا فرقہ کی زمین نہیں ہے۔ یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا"۔ جو مظالم آئے دن

وفاتر میں شہروں میں اور ریاستوں میں کیے جا رہے ہیں اور جس تعصب وعدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح ہندو دیوتا گاندھی اور نہرو صاحب نے دیا ہے۔ ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع نہیں کر سکتے"۔

(مکتوب مولانا حسین احمد بنام مولانا شوکت علی ہفت روزہ "سعادت" لائل پور، یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء ص ۶)

۲۔ "بلاشبہ متحدہ قومیت عمدہ اور اعلیٰ چیز ہے اور حصول آزادی کے لیے کار آمد نسخہ ہے۔ مگر افسوس کہ ہندوستانی اکثریت نہایت تنگ دل ہے اور پھر ہم سے بدرجہا منظم اور تعلیم یافتہ ہے۔ تعصب اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ پھر اقلیتیں بالخصوص مسلم اقلیت کس طرح مطمئن ہو سکتی ہے متحدہ قومیت کے راگ الاپے گئے۔ مسلمانوں کو اس طرف کھینچا گیا۔ مگر کیا ابنائے وطن نے بھی کوئی ثبوت رواداری اور متحدہ قومیت کا دیا ہے . . . . افسوس ہے کہ مسلمانوں میں چند سمجھدار ہستیاں ہمیشہ کی طرح ان کی ہمنوا بن گئیں اور مسلمانوں کے ٹکڑے کرنے کی تجویزوں اور تدبیروں کے ساتھ اپنے ابنائے وطن کے ساتھ میدان میں آگئیں"۔

(ایضاً ص ۶)

مولوی صاحب نے اپنی سرگذشت "نقش حیات" میں اس مسئلہ پر زیادہ کھل کر بحث کی ہے۔ جب یہ کتاب تحریک پاکستان کے ایک مخلص کارکن جناب عبدالوحید خاں صاحب کی نظر سے گزری تو انہوں نے اس پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھا جو ان کے مجموعہ مقالات "تاثرات و تصورات" میں شامل ہے۔ اس قیمتی مقالہ کے چند اقتباسات ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

۱۔ "مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور اقبال جیسی عظیم المرتبت ہستیوں سے کتنا ہی اختلاف ہو ان کے کمالات اور صفات سے کوئی شخص آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ حضرات دو مختلف مکاتب خیال کے نمائندے تھے۔ اول الذکر دونوں حضرات متحدہ قومیت کے داعی، سیکولر، حکومت کے حامی اور مسلم و غیر مسلم افراد کی مشترکہ حکومت اور متحدہ کلچر کے طرف دار تھے۔ جب کہ حضرت اقبال وطنیت اور متحدہ قومیت کے دشمن اور خالص اسلامی اور قرآنی نظام حکومت کے مبلغ اور علمبردار تھے۔"[لہ]

۲۔ "مولانا حسین احمد مرحوم نے ۱۹۳۸ء میں اپنی ایمانداری سے ایک اصول بیان کیا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" اور مسلمانوں کو نہایت غیر مبہم الفاظ میں مشورہ دیا کہ وہ اپنی سیاست کی بنیاد "متحدہ قومیت" کے نظریے پر قائم کریں۔ حضرت اقبال نے اس نظریہ پر مخصوص انداز میں ایک ضرب رسیدگی اور فارسی کے تین اشعار کا یہ مشہور قطعہ تصنیف کیا ؎

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

لہ تاثرات و تصورات تالیف عبدالوحید خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء ص ۲۶۷، ۲۶۸۔

یہ اصولی اختلاف اس قسم کے لوگوں کے لیئے سوہان روح بن گیا۔ جو اپنے پیروں کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں یا جن کا اصول یہ رہتا ہے۔ ؎

واعظ سے اُدھر اک بات سنی ساقی سے اِدھر اک جام لیا

ایسے لوگ جو نماز حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پیچھے اور دستر خوان پر معاویہ کے ساتھ ہوں کبھی سکون قلب حاصل نہیں کر سکتے۔"[لہ]

۳۔ "ہم جیسے لوگ جو مولانا سے عقیدت رکھتے تھے یہی سمجھتے رہے کہ شاید مولانا نے جدید نظریہ "وطنیت" کے شر انگیز پہلوؤں کا مطالعہ نہیں کیا وہ بیرونی طاقت کے مقابلے میں متحدہ محاذ کو ہی "متحدہ قومیت" کے لفظ سے موسوم کرتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت اقبال خدا کو پیارے ہو گئے۔ مگر وطنیت اور قومیت کا اکھاڑہ ویسے ہی قائم رہا مولانا مودودی نے وطنیت اور قومیت سے متعلق خطرات کا "ترجمان القرآن" میں بڑی وضاحت سے ذکر فرمایا اور جمعیت العلماء ہند کا ترجمان "الجمعیۃ" اور "انصاری" ان کے جوابات دیتا رہا۔ ایک طرف وہی اقبال کا نظریۂ ملت اور دوسری طرف وطنیت اور ہندوستانیت۔ علامہ اقبال کی تشریحات کو یہ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا اس کی ہمنوائی میں سب کچھ کر رہے ہیں۔ حالانکہ مرحوم (یعنی حضرت اقبال) نے اپنے بیان میں اس امر کی صاف تردید کر دی تھی کہ ان کے نظریات کا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اپنی

لہ ایضاً ص ۲۶۸، ۲۶۹۔

عمر کے نصف حصہ سے زائد کو انہوں نے ،، وطنیت ،، کی مخالفت میں گزارا لیکن مولانا مودودی نے اپنی تصریحات میں مسلم لیگ پر بھی اس طرح ضربیں لگائیں جس طرح جمعیۃ العلماء وغیرہ پر۔ کیوں کہ ان کے نزدیک نیشنلزم خواہ وہ وطنیت پر قائم ہو یا نسل پر، خواہ وہ ہندوستانی قومیت ہو یا مسلم قومیت ہر صورت میں ناقابل قبول ہے۔ مولانا حسین احمد اور ان کے حامی آخر وقت ان سے بھی لڑتے رہے اور طرح طرح کی تاویلیں کرتے رہے۔"[12]

۴۔ ،، صرف یہی نہیں بلکہ تقسیم ہند کے بعد مولانا نے دو جلدوں میں اپنی سوانح عمری مرتب کی۔ جو ان کی زندگی میں ،، نقش حیات ،، کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں تو انہوں نے بالکل ہی کمال کر دیا ہے۔ معلوم نہیں ان کے وہ عقیدت مند جن کا خیال ہے کہ مولانا نے ،، متحدہ قومیت ،، کا نظریہ سرے سے پیش ہی نہیں کیا بلکہ چند عاقبت فروشوں نے ان کی طرف ایک جملہ منسوب کر دیا تھا۔ ،، نقش حیات ،، میں ان کے نقوش وخطوط سے واقف ہیں یا نہیں۔ جو مولانا مرحوم نے اپنے تخیل کے مطابق اسلامی سیاست سے متعلق کیے ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا اس مقام سے آگے نکل چکے ہیں جہاں حضرت اقبال نے اپنے فارسی قطعہ سے ان کو ٹوکا تھا اور جس کے ،، ارمغان حجاز ،، میں شائع ہوتے پر وہ چراغ پا ہیں۔ ہمیں کسی شخص کی دیانت رائے پر شک نہیں نہ کسی کی نیت پر حملہ کرنا مقصود ہے۔ بالخصوص جب کہ ہم جانتے ہیں کہ عشق اعا

---

[12] ایضاً ص ۲۷۴۔

نیازمندی عاشق کی نگاہوں کی وسعت کو سمیٹ کر معشوق کی خوبیوں پر مرکوز کر دیتی ہے اور اس میں تنقید وتجزیے کی صلاحیت باقی نہیں چھوڑتی۔ اس لیے ہم جہاں ان لوگوں (مولانا کے معتقدین) کو معذور اور قابل معافی سمجھتے ہیں، وہیں اصل حقیقت کا انکشاف بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ اندازِ نگاہ اور زاویۂ نظر اگر ہو سکے تو توازن اور اعتدال کی طرف آسکے اور شاید وہ یہ سمجھ سکیں کہ بڑے سے بڑا عالم بھی نسیان اور خطا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر ہم ان بزرگوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ،، نقش حیات ،، جلد دوم میں ظاہر کیے ہوئے مولانا کے افکار کو غور سے پڑھے بغیر شیخ الہند اور حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے دو متضاد نظریات سیاست میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ناکام کوشش نہ کریں۔ اگر ان کو شیخ الہند کے اصولوں سے اتفاق ہے تو انہیں اس کا پورا اختیار ہے اور ہمیں اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں اور وہ خوشی سے ان اصولوں کی تبلیغ کریں۔ خدا کے لیے دو اصولوں کو جو آپس میں متصادم ہیں۔ ایک ثابت کرنے میں وقت ضائع نہ کریں اور عوام کے ذہنی انتشار کا موجب نہ بنیں۔"[13]

مولانا حسین احمد نے اپنی تصنیف ،، پاکستان کیا ہے ،، میں اپنے نظریہ کی ترجمانی اس طرح کی ہے:۔

،، اگر عربی اور اردو اصطلاح اور عرف کو دیکھیں یا قرآنی شہادتوں کا لحاظ کریں تو اسباب قومیت صرف مذہب میں منحصر نہیں ہوتے۔ کبھی متحدہ قومیت جغرافیائی حدود اور وطنیت سے ہوتی ہے۔ تو کبھی نسل کی

ایضاً ص ۲۷۴۔

حیثیت سے کبھی پیشہ کی حیثیت سے اور کبھی رنگت وغیرہ وغیرہ سے۔" [سلہ]

صرف مندرجہ بالا اقتباسات ہی یہ ثابت کرنے کے لیئے کافی ہیں کہ مولانا مرتے دم تک "متحدہ قومیت" کے غیر اسلامی نظریہ کے مبلغ و مؤید رہے۔

[سلہ] متحدہ قومیت اور اسلام تالیف مولانا حسین احمد مطبوعہ دہلی ۱۹۳۸ء ص ۱۱۔

باب ۸

جواب آں غزل

مولانا کے مقالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کے مسلم مفکرین کی طرف سے جوابات

مولانا حسین احمد کے مقالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کے چھپنے سے پہلے ہی حضرت علامہ تو اپنے خالقِ حقیقی کے پاس جا چکے تھے۔ لیکن ان کے نام لیواؤں اور اسلام کے پجاریوں میں ایسے کافی صاحب درد اور فاضل لوگ موجود تھے۔ جنہوں نے مولوی صاحب کی اس غلط روش کا سختی سے نوٹس لیا اور ان کے مقالہ کی تردید میں زوردار مضامین اور مقالے اخبارات و رسائل میں شائع کرائے۔ ایسے مقالوں میں شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن دہلوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا رازی (جناب غلام احمد پرویز کا فرضی نام) کے مقالے نمایاں حیثیت و مقام کے حامل ہیں۔ مولانا مودودی اور مولانا رازی کے مقالات علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے۔

مولانا رازی اپنے مقالہ کے شروع میں رقم طراز ہیں:۔

"جب ہم نے دیکھا کہ حضرت علامہ کی وفات کے قریب ۲ ماہ بعد مولانا صاحب نے مرحوم کے آخری بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کرا دیا جو اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ مولانا صاحب اس سے متعلق پمفلٹ نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب شائع فرما دیتے۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس انداز سے یہ پمفلٹ لکھا گیا ہے وہ کچھ پسندیدہ نہیں ہے۔ اس میں افہامِ حقیقت سے زیادہ زور حضرت علامہ کی تردید میں صرف کیا گیا ہے اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ غم و غصہ کے انتقامی جذبات ایک ایک صفحہ سے ٹپکتے نظر آ رہے

ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ اس تحریک کا محرک کون سا جذبہ تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے وقت میں جب کہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ فریقِ ثانی موجود ہی نہیں ہے جو کسی کے جی میں آئے کہہ ڈالے اور اس سے کہنے والے کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ طرزِ عمل کس چیز کا آئینہ دار ہوتا ہے اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت علامہ زندہ ہوتے تو ملتِ اسلامیہ کے سامنے اس پمفلٹ کے جواب کے بہانہ سے قرآن کریم کے حقائق و معارف کا ایک اور باب کھل جاتا۔ اب ان کی جگہ لینے والا کون ہے لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے۔ ؎

اگرچہ مے کدہ سے اُٹھ کر چل دیا ساقی!

وہ مے، وہ خم، وہ صراحی، وہ جام باقی ہے

کہ خم کدہ اقبال میں ایسے ایسے رندانِ قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشمِ مست کے صدقے شرابِ ہندی اور بادۂ حجازی میں ایک نگاہ میں تمیز کر کے بتا دیں۔ "طلوعِ اسلام" جسے پیامِ اقبال کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآن حکیم روشنی میں "متحدہ قومیت" کے نظریہ کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے"[1]

اس کے بعد مؤلف نے مختلف سرخیاں مثلاً متحدہ قومیت کا مفہوم، اسلامی جماعت سے علیحدگی کفر ہے۔ عہد و پیمان کے تعلقات، غیر مسلموں سے موالات اور متحدہ قومیت کا غیر قرآنی تصور کر کے مولانا حسین احمد کے ہر نکتہ کا قرآن و حدیث کی روشنی میں مدلل جواب پیش کیا ہے۔ یہ کتابچہ اپنی اہمیت و افادیت کے پیش نظر

---

[1] متحدہ قومیت اور اسلام تالیف مولانا رازی مطبوعہ لاہور ص ۴۔ ۵۔

اس قابل ہے کہ اسے پورے کا پورا ذیل میں درج کیا جائے۔ لیکن ہم اس کی بجائے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے مقالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کا خلاصہ انہیں کے اپنے الفاظ میں قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں:۔

ایک تو یہ کہ مولانا مودودی صاحب بھی مولانا حسین احمد کی طرح بنیادی طور پر دیوبندی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور باوجود اختلاف کے ایک مسلمہ حیثیت کے مالک ہیں۔ دوسرے وہ جس طرح نظریۂ "متحدہ قومیت" کے مخالف ہیں اسی طرح وہ نظریۂ "مسلم قومیت" کے بھی خلاف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ خود بھی صراط مستقیم سے بھٹک گئے اور موجودہ زمانہ میں احیاء اسلامی کی سب سے بڑی اسلامی تحریک "تحریک پاکستان" کی مخالفت کے لیے انہوں نے اپنی اور اپنے ہم مسلک حضرات کی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دیں۔ بہر حال مقالہ مدلل بھی ہے اور مفصل بھی اب اس کا خلاصہ ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

"اس عنوان (یعنی متحدہ قومیت اور اسلام) سے جناب مولانا حسین احمد صاحب دارالعلوم دیوبند کا ایک رسالہ حال میں شائع ہوا ہے ایک نامور عالم دین اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے مصنف کا جو مرتبہ ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں توقع تھی کہ رسالہ میں "قومیت" کے اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ کی تنقیح و تحقیق خالص علمی طریقہ پر کی گئی ہوگی اور اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح کر دیا گیا ہوگا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس رسالہ کو اپنی توقعات اور مصنف کی ذمہ دارانہ حیثیت سے بہت فروتر پایا۔ ایک مصنف کی تصنیف میں سب سے پہلے جس چیز کو تلاش

کرنا چاہیئے وہ اس کا زاویۂ نظر ہے۔ اس لیئے کہ اپنے موضوع کے ساتھ مصنف کا برتاؤ اور اس کا صحیح یا غلط نتائج پر پہنچنا تمام تر اس کے زاویۂ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ سیدھا اور صحیح زاویۂ نظر یہ ہے کہ آدمی محض امر حق کا طالب ہو اور اس مسئلے کو جیسا کہ وہ فطرۃً اور حقیقۃً ہے اس کے اصلی رنگ میں دیکھے اور حقیقت کا یہ مشاہدہ جس نتیجہ پر بھی پہنچاتا ہو۔ اس پر پہنچ جائے بلا اس لحاظ کے کہ وہ کس کے خلاف پڑتا ہے اور کس کے موافق۔ یہ بحث و تحقیق کا فطری اور علمی زاویۂ نظر ہے۔ اس سیدھے زاویۂ نظر کے علاوہ بہت سے ٹیڑھے زاویائے نظر بھی ہیں، مثلاً یہ کہ آپ کسی کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اس لیئے صرف اسی نتیجہ کی طرف جانا چاہتے ہیں جو اس کے موافق ہو اور دوسرا یہ کہ آپ کو کسی سے بغض و عداوت ہے۔ اس لیئے آپ کو تلاش صرف انہی چیزوں کی ہے۔ جو آپ کے مبغوض کے مخالف ہوں۔ اس قسم کے ٹیڑھے زاویے جتنے بھی ہیں سب کے سب خلاف حق ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ مولانا نے اس رسالے میں کون سا زاویۂ نظر اختیار فرمایا ہے۔ اپنی بحث کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ضروری معلوم ہوا کہ ان غلطیوں کا ازالہ کر دوں۔ جو اس قسم کی متحدہ قومیت سے مخالفت اور اس کو خلافِ دیانت قرار دیتے ہوئے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں۔ کانگرس ۱۸۸۵ء سے اہل ہندوستان سے بنا بر وطنیت اس اتحاد قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جد و جہد عمل میں لا رہی ہے۔ اور اس کی مقابل و مخالف قومیں اس کے غیر قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لا رہی ہیں۔ یقیناً برٹش شہنشاہیت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی

خطرناک خبر نہیں ہے۔ یہ چیز میدان میں آج نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً ۱۸۸۶ء یا اس سے پہلے لائی گئی ہے۔ اور مختلف عنوانوں سے اس کی وجی ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں لائی جاتی ہے۔"

(متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ دیوبند طبع اول ص ۲،۵)

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"ان کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ مگر باوجود کمالات گوناگوں ساحران برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو گئے تھے۔"

مولانا مزید فرماتے ہیں :۔

"افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی شخص متحدہ قومیت اور الفائے وطنیت و نسل و لسان وغیرہ کا واقف کار نہ ہوا اور نہ یورپ کے اخباروں، رسائل لکچراروں کی بے حد و شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پان اسلام ازم ایک قصۂ پارینہ ہو کر فنا کی گھاٹ اتر گیا اور ممالک اسلامیہ یورپین اقوام کے لقمۂ تر بن کر رہ گئے۔ اب جب کہ مسلمانوں کو افریقہ و یورپ، ایشیا وغیرہ میں پارہ پارہ ہو کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم کو کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے وہ کسی غیر مسلم جماعت کے ساتھ متحدہ قومیت بنا سکتا ہے۔"

(ایضاً ص ۳۶، ۳۷)

مولانا حسین احمد اپنے مسلک کی مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں :۔

"ہندوستانیوں کا وطن کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لیے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو کہ ہم نے پروفیسر "سیلے" کے مقالہ سے ظاہر کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ جذبہ ضعیف سے ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے۔ اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت بھی موجود نہ ہو، مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لیے اشتراک عمل شرمناک امر ہے۔ انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

(ایضاً ص ۳۸)

مندرجہ بالا عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی نگاہ میں حق اور باطل کا معیار صرف برطانیہ بن کر رہ گیا ہے وہ مسئلہ کو نہ تو علمی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ حقائق اپنے اصل رنگ میں نظر آسکیں۔ نہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے زاویۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیئے زہر ہے انہیں زہر دکھائی دے سکے۔ ان دونوں زاویوں کی بجائے ان پر فقط برطانیہ کی عداوت کا زاویۂ نظر مستولی ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی سے انہیں اتنی دل چسپی نہیں جتنی برطانیہ کی موت سے ہے اور جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ چکی ہے کہ "متحدہ قومیت" برطانیہ کے لیئے مہلک ہے۔ تو جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ برطانیہ پرست کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیئے تاریخ کے مشہور اور یقینی واقعات کو بھی صاف نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یورپ جب مسلمانوں میں نسلی، وطنی اور لسانی قومیتوں کی تبلیغ کر رہا تھا تو کیا مسلمانوں میں کوئی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ کیا ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مصطفیٰ کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، اقبال، مولانا محمد علی، شوکت علی کا نام بھی مولانا نے نہیں سنا۔ کسی کے کارنامے ان تک نہیں پہنچے۔ کیا ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو متنبہ نہیں کیا کہ یہ جاہلیت کی تفریق تم کو تباہ کرنے کے لیئے برپا کرائی جا رہی ہے۔

مولانا کا ارشاد ہے کہ "فی زمانا قومیں اوطان سے بنتی ہیں" لیکن یہ ایک

قطعی غلط اور سراسر بے بنیاد دعوٰے ہے۔ پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کوئی قوم وطن سے بنی ہو۔ اس میں شک نہیں ایک ملک کے باشندوں کو باہر ان کے ملک کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مثلاً خواہ حبشی ہو خواہ فرنگی باہر والے اس کو امریکن ہی کہیں گے۔ مگر کیا اس سے حقیقت یہ بدل جاتی ہے کہ امریکہ میں یہ دو الگ الگ قومیں ہیں نہ کہ ایک قوم یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو۔ مثلاً مولانا حسین احمد باہر تشریف لے جائیں تو ان کو "برٹش نیشنیلیٹی" سے منسوب کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اصطلاحی قومیت حقیقت میں بھی مولانا کی قومیت بدل دے گی۔ پھر بھلا علمی حیثیت سے اس استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے کہ "اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب ہندو، مسلمان، سکھ ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں"۔ شمار ہونے اور فی الواقع ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ایک کو دوسرے کے لیئے نہ تو دلیل بنایا جا سکتا ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو فی الواقع وہی ہونا چاہیئے جیسے وہ شمار کیئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا لغتِ عرب کی طرف رجوع فرماتے ہیں اور شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں قوم کے معنی ہیں "مردوں کی جماعت"، یا "مردوں اور عورتوں کا مجموعہ"، یا "ایک شخص کے اقرباء"، یا "دشمنوں کی جماعت"، مثلاً وہ آیات جن میں کفار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یا مسلمانوں کی قوم قرار دیا گیا ہے جو صریحاً تیسرے اور چوتھے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یا وہ آیات جن میں لفظِ قوم پہلے یا دوسرے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اس پوری بحث میں مولانا کو ایک مرتبہ بھی خیال نہ آیا کہ اس وقت جو بحث درپیش ہے۔ وہ لفظ "قوم" کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ جواہر لال اور سید محمود لغتِ عرب اور قرآنی زبان میں کلام نہیں کرتے۔ ان کے الفاظ کا تو وہی مفہوم ہے اور وہی ہو سکتا

ہے کہ آج کل ان سے مراد لیا جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان میں "قوم اور قومیت" کے الفاظ انگریزی زبان کے الفاظ Nation اور Nationalism کے مقابلہ میں بولے جاتے ہیں جس کی تشریح لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" میں بدیں الفاظ کی ہے:۔

"ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جس کی چند مخصوص جذبات نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں سے بڑے اور طاقت ور جاذبے تو دو ہیں۔ ایک جاذبہ نسل اور دوسرا جاذبہ دین، لیکن ایک مشترک زبان کے استعمال اور مشترک لٹریچر سے دلچسپی اور زمانہ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد اور مشترک رسوم و عقائد، مشترک تخیلات اور افکار اور مشترک مقاصد و حوصلوں کا بھی اس احساس جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ کبھی یہ سب رابطے یکجا موجود ہوتے ہیں اور مجموعۂ افراد کو بستہ اور پیوستہ رکھتے ہیں اور کبھی ان کے میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے۔ لیکن قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے"۔

(اقتباس ۱۱)

کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اس معنی میں کفار و مشرکین اور مسلمانوں کو ایک جمعیت میں جمع ہونا جائز رکھا ہے یا کوئی نبی، دنیا میں اس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو اسی معنی میں ایک قوم بنائے۔ اگر نہیں تو یہ فضول لغوی بحث آخر کیوں چھیڑی جاتی ہے۔ لفظ اپنے معنی تاریخ کے دوران میں بار بار بدلتا ہے۔ کل ایک لفظ کسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ آج کسی اور معنی میں ہوتا ہے۔ اب یہ لفظی مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ معنوی تغیرات کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائیں کہ قرآن کی رو سے "قومیت میں اشتراک مسلم و کافر ہو سکتا

ہے۔

آگے چل کر مولانا دعوے فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہود اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنائی تھی اور اس کے ثبوت میں وہ معاہدہ پیش کرتے ہیں، جو ہجرت کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ "وان یہود بنی عوف امتہ مع المؤمنین"

(ترجمہ بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہوں گے) مولانا کے ہاتھ آگیا۔ بس یہ فقرہ کہ یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے یہ دعوے کرنے کے لئے کافی سمجھا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لیکن یہ پھر لفظی مغالطہ ہے۔ لغتِ عرب میں امت سے مراد ہر وہ جماعت ہے جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو۔ عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز۔ اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں کسی ایک مشترک مقصد کے لیئے عارضی طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک امت کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ صاحبِ لسان عرب لکھتے ہیں:۔

"وقولہ فی الحدیث ان یہود بنی عوف امتہ یرید

انھم بالصلح الذی وقع بینھم وبین المومنین کجماعۃ منھم

کلمتھم وایدیھم واحدۃ"

ترجمہ۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "ان یہود بنی عوف امتہ من المؤمنین" اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہو گئے ہیں۔ اور ان کا معاملہ واحد ہے۔

اس لغوی امت کو آج کل کی اصطلاحی "قومیت" سے کیا واسطہ۔ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل سیاسی زبان میں فوجی اتحاد کہہ سکتے ہیں۔ یہ محض ایک تحالف تھا۔

جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر رہیں گے۔ دونوں کی تمدنی وسیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی۔ البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے۔ کیا اسی کا نام "متحدہ قومیت" ہے۔ کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اُس "متحدہ قومیت" سے مماثلت رکھتی ہے۔ جو اس وقت معرضِ بحث ہے۔ کیا وہاں کوئی مشترک سٹیٹ بنایا گیا تھا۔ کیا وہاں کوئی مشترک مجلس قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں جس کی اکثریت ہوگی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اسی کے منظور کیئے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے۔

مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ اس میں آج کل کی متحدہ قومیت کے عناصرِ ترکیبی میں سے کون سا عنصر پایا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی ایک عنصر کا بھی پتہ نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی بازپرس کا خوف نہیں کہ محض "امتہ من المؤمنین" یا "امتہ مع المؤمنین" کے الفاظ معاہدۂ نبوی میں دیکھ کر وہ مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جیسی متحدہ قومیت آج کل کانگرس بنا رہی ہے۔ ویسی ہی متحدہ قومیت کل نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنا چکے تھے۔ لہٰذا آؤ اور اطمینان سے اس میں جذب ہو جاؤ۔ پھر مولانا اس متحدہ قومیت کے جواز میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:۔

"ہم روزانہ مفاد ہائے مشترک کے لیئے ہیئاتِ اجتماعیہ بناتے ہیں، اس میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کی ممبری اور شرکت کے لیئے انتہائی جد وجہد کرتے ہیں۔ میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات اسمبلیاں، ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور اس قسم کی سینکڑوں انجمنیں اور ایسوسی ایشنیں ہیں جو کہ ان ہی اصولوں اور قواعد سے عبارت ہیں جو کہ اس خاص

مقصد کے ماتحت ہیئتِ اجتماعیہ کے لیئے بنائے گئے ہیں، تعجب ہے
کہ ان میں حصہ لینے اور مکمل یا غیر مکمل جد وجہد کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاتا
مگر اسی قسم کی کوئی انجمن اگر آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف قائم
ہو تو وہ حرام، خلافِ دیانت، خلافِ تعلیماتِ اسلامیہ اور خلاف عقل
ودانش ہوتی ہے۔"

(ایضاً ص ۴۱)

یہ بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ ایک گناہ کو جائز فرض کر کے اس کی تحبت پر مولانا اسی
قسم کے دوسرے گناہ کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں ایک ہی علتِ
حرمت پائی جاتی ہے اور مقیس ومقیس بہ دونوں ناجائز ہیں۔ تاوقتیکہ یہ علت ان سے دور
نہ ہو، علمائے کرام مجھے معاف فرمائیں، میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور
اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے
اس لیئے کہ ان کی تحلیل وتحریم حقیقتِ نفس الامری کے ادراک پر تو مبنی ہے نہیں۔ محض
گاندھی جی کی جنبشِ لب کے ساتھ ان کا فتویٰ گردش کرتا ہے۔

مولانا نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں نہ کانگرس کے مقصد ومدعا
کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انہوں نے غور کیا ہے۔ نہ ان کو یہ خبر ہے کہ اجتماعی
مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں۔ ان کے حدودِ اختیار وعمل
موجودہ دستور کے تحت کس طرح اور کن کن راہوں سے اس دائرے میں نفوذ کرتے
ہیں جس کو تہذیب وتمدن اور عقائد واخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مولانا
بایں ہمہ علم وفضل، کلچر، تہذیب، پرسنل لا وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال کر رہے
ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی ومفہوم سے ناآشنا ہیں۔
مولانا نے اپنے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے

جس کے حدود انہوں نے تمام شرعی شرائط ملحوظ رکھ کر اور تمام امکانی اعتراضات سے
پہلو بچا کر خود مقرر فرمائے ہیں اور ان کو وہ ایسی پُر احتیاط مفتیانہ زبان میں بیان فرماتے
ہیں کہ قواعدِ شرعیہ کے لحاظ سے کوئی اس پر حرف نہ لا سکے۔ لیکن اس میں خرابی بس اتنی
ہی ہے کہ اپنے مفہوم ذہنی کو مولانا کانگرس کا مفہوم ومدعا قرار دے رہے ہیں۔ اگر
مولانا صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "متحدہ قومیت" سے میری مراد یہ ہے تو ہمیں
ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں، کہ نہیں
کانگرس کی مراد بھی یہی ہے کہ کانگرس بالکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر چل رہی ہے
مولانا کو اپنے مفہوم ذہنی کے لیئے تحالف یا وفاق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ اختیار کرنا
چاہیئے تھا۔ اس وفاق یا تحالف کو بھی اپنی تجویز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیئے تھا۔
نہ اس حیثیت سے کہ یہ کانگرس کا عمل ہے۔ کم از کم اب وہ امت پر رحم فرما کر اپنی غلطی
محسوس کر لیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی۔"

(مسلم قومیت مطبوعہ لاہور، طبع قدیم غالباً ۱۹۳۹ء بار اول صفحات ۴۶ تا ۴۴)

یہ ہے مودودی صاحب کا خلاصہ ان کی اپنی زبان میں۔ یہ الگ بات ہے کہ
بعد میں وہ خود بھی لبِ کوثر سے پھسل گئے۔ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن خاں صاحب کا مقالہ ماہنامہ
برہان "دہلی کے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ جو مولانا رازی اور مولانا مودودی
کے مقالوں سے بھی زیادہ اہم اور وقیع ہے۔ لیکن مولانا مودودی صاحب کے مقالہ کا
خلاصہ درج کرنے کے بعد اس کے اقتباسات کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی جو اصحاب
تفصیل میں جانا چاہتے ہیں وہ ہر سہ مقالہ جات کا مکمل طور پر مطالعہ فرمائیں، مولانا رازی کا
مقالہ حال ہی میں مکتبہ حبیبیہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ اب ہم کتاب کے آئندہ باب میں
اس پر بحث کریں گے کہ مولانا حسین احمد صاحب مسلم لیگ سے کیوں علیحدہ ہوئے۔

باب ۹

مولانا حسین احمد اور اُن کے ساتھیوں کا مسلم لیگ سے اخراج

(حسین احمد کی مسلم لیگ سے علیحدگی)
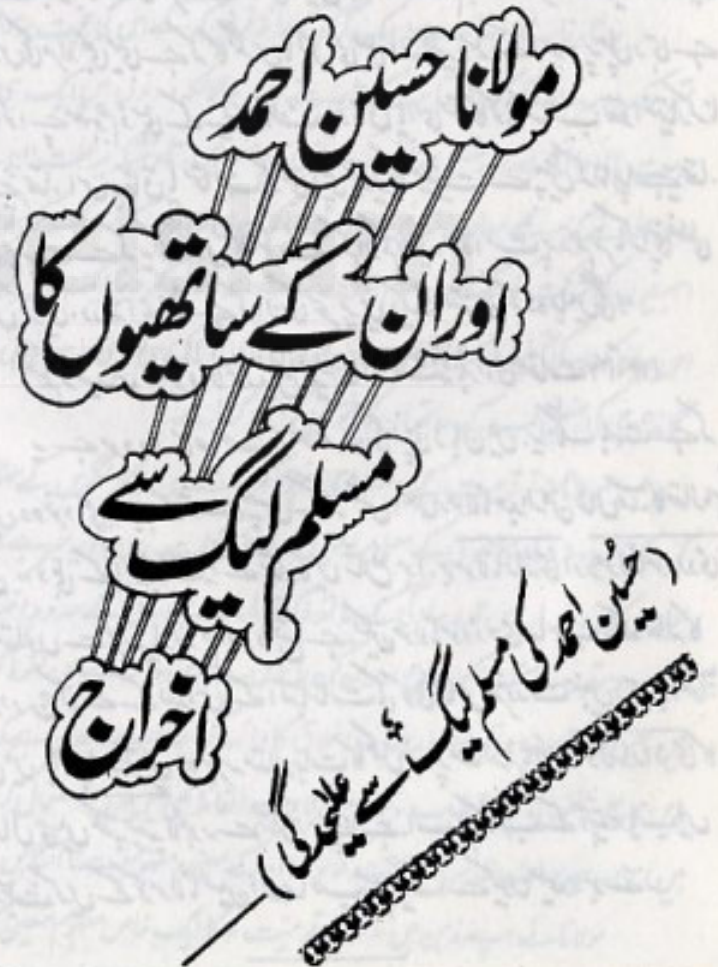
مولانا حسین احمد صاحب اپنے خط بنام طالوت صاحب میں لکھتے ہیں :-

"مسلم لیگ کی شرمناک کارروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب میں علیحدہ ہوا ہوں ہر قسم کے سب و شتم کا بہ نسبت سابق زیادہ نشانہ بنا ہوں وہ کون سے الفاظ و معاملات ہیں جو نہیں کہے گئے"[1]

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے مولانا صاحب اور اُن کے دیگر ساتھیوں نے مسلم لیگ میں شرکت چند مخصوص اغراض کو اپنے خانۂ دل میں چھپاتے ہوئے کی تھی لیکن جب یہ اغراض پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو انہوں نے مسلم لیگ کو خیرباد کہہ دیا۔ ان کی خاص اغراض یہ تھیں :-

۱۔ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اور اُس کو اپنے ڈھب پر لا کر اُس کا کانگرس کے ساتھ الحاق کر دیا جائے۔

۲۔ مسلم لیگ سے حسب خواہ مالی فائدہ اٹھایا جائے کیوں کہ ان کے زعم میں مسلم لیگ کے پاس کافی فنڈ جمع تھا۔

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو :-

مولانا صاحب کے ایک ساتھی مولوی محمد اسمٰعیل سنبھلی نے مسلم لیگ سے علیحدہ ہونے کی وجہ اس طرح بیان فرمائی ہے :-

"۱۹۳۶ء کے الیکشن کے سلسلے میں جب کہ مسلم لیگ پالیمنٹری بورڈ کی تشکیل

[1] متحدہ قومیت اور اسلام تالیف مولانا حسین احمد مطبوعہ لاہور ص ۲۲۔

عمل میں آئی تو ہم لوگ اس بورڈ میں صرف اس توقع پر داخل ہوئے تھے کہ یہ جماعت آزاد خیال افراد پر مبنی ہوگی اور اس کی تمام تر کوشش اور مساعی آزادئ وطن اور رجعت پسند طبقہ کو زیر کرنے کے لیے ہوگی چنانچہ صاف اور واضح الفاظ میں مسٹر محمد علی جناح نے اس بات کا وعدہ کیا اور ہر طرح جماعتِ علماء کو اس بات کا اطمینان دلایا اور بڑی حد تک الیکشن کے زمانہ میں اس وعدہ کی پابندی بھی کی گئی۔ لیکن الیکشن سے فارغ ہونے کے بعد فوراً ہی جناح صاحب نے نہ معلوم کن مخفی وجوہ کی بنا پر اپنی روش بدل دی اور باوجود ہماری زبردست مخالفتوں کے انہوں نے اس رجعت پسند طبقہ کو شامل کرنا چاہا اور اس "مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ" کو جو مسلم لیگ جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار اور کانگرس کے ممبران سے ترتیب دیا گیا تھا، کانگرس کے مدمقابل بنانے کی انتہائی کوشش کی اور کانگرس کو خالص ہندوؤں کی جماعت کہنا شروع کر دیا۔ جب ہم نے اس معاملے میں احتجاج کیا اور جناح صاحب کو ان کے مواعید یاد دلائے اور بتایا کہ جماعتِ علماء بورڈ میں صرف اس لیے داخل ہوئی تھی کہ کانگرس کے ساتھ مل کر آزادئ وطن کے لیے کوشش کی جائے گی اور رجعت پسند طبقہ کو ایک ایک کر کے علیحدہ کر دیا جائے گا اور یہ صرف آزاد خیال لوگوں کی جماعت رہے گی۔ آپ رجعت پسندوں کو اس میں داخل کر رہے ہیں اور کانگرس کے ساتھ بجائے اشتراکِ عمل اور اتحادِ عمل کے مخالف جا رہے ہیں، تب جناح صاحب نے اور بعض دیگر لوگوں نے ہتک آمیز رویہ اختیار کیا اور کہا علماء کی شرکت اور مساعی سے ہم کو الیکشن میں کامیابی نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمارے مینوفسٹو کی وجہ سے ہم کو کامیابی ہوئی تھی۔ اگر جماعتِ علماء اس طرزِ عمل کو پسند نہ کرے تو ہمیں مطلق اس کی

پرواہ نہیں اسی قسم کی اور باتیں بھی کہی گئیں"۔[ٹہ]

مسلم لیگ سے علیحدگی کے بعد مولانا نے خود جو بیان جاری کیا وہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہ بیان بھی اُن کی دوسری تحریروں کی طرح اُن کی منفیانہ زبان کا شاہکار ہے:

"وہ خطاب یافتہ اور پنشن پانے والے حضرات جن کا فرض اصلی برطانیہ کی نمک خواری اور اس کا راگ گاتے رہنا تھا اور وہ ملازمت پیشہ حضرات اور ان کے اقارب و اعزہ جن کا دین مذہب برطانیہ ہی تھا۔ سب کے سب فوجاً فوجاً جوق در جوق لیگ میں داخل ہو گئے اور مسٹر جناح کے کار گزر بن گئے لیگ کے مراکز سے نہ صرف تفرقہ اندازی بلکہ دہشت انگیزی اور دشنام طرازی، افترا پردازی اور بدطرازی کی بھی لپٹیں اُٹھنے اور چنگاریاں مشتعل ہونے لگیں جدھر دیکھو اُدھر مسٹر جناح اور ان کے نئے نئے اتباع مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا مظہر الدین صاحب مدیران انقلاب و احسان مولانا اکرم خاں صاحب وغیرہ وغیرہ نے ایسی پٹی کھائی کہ ان کی شرربار تقریروں اور تحریروں سے فضائے ہندوستان سمومیت کے دلدل میں پھنس کر رہ گئی۔ مسٹر محمد علی جناح اور ان کی پارٹی جو ۱۹۳۷ء کے الیکشن کے بعد سے مرکزی اسمبلی میں کانگرس کے ساتھ ہو کر برابر دو سال تک گورنمنٹ کو شکستوں پر شکستیں دے رہے تھے اور جو کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس مسلم لیگ بمبئی اور پارلیمنٹری بورڈ کے مینوفسٹو اور پروگرام وغیرہ کی بنا پر کانگرس کے بالکل قریب تر آ گئے تھے۔ یک بارگی ایسے پلٹے کہ الامان و الحفیظ۔ لکھنؤ کے اجلاس کا سارا خطبہ کانگرس کی مذمتوں اور اس پر تنقیدات

[ٹہ] مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل تالیف مولانا حسین احمد مطبوعہ دہلی ۱۳۶۵ھ ص ۲۶،۲۵۔

سے بھر دیا گیا۔"[۳]

مندرجہ بالا ہر دو بیانات سے صاف طور پر واضح ہے کہ مولانا صاحب اور اُن کے ہم نوا شامل تو تھے مسلم لیگ میں لیکن ان کی دلی ہمدردیاں کانگرس کے ساتھ تھیں کسی نے سچ کہا ہے۔

"روندی دُکھ یاراں دے نوں لے کے ناں بھراواں دا"

اسی زمانہ میں جناب محمد علی جناح صاحب کو اُن کی ملی و سیاسی خدمات کی بنا پر قوم کی طرف سے "قائد اعظم" کا خطاب دیا گیا تو مولانا نے اس خطاب کا اپنے خاص انداز میں یُوں مذاق اڑایا۔

"باوجودیکہ مسٹر جناح اسلام، اہلسنت اور اہل مذہب سے نہ صرف مستغنی بلکہ سخت متنفر بھی۔ نہ اس بے چارہ نے مذہبی ہونے یا مذہبی قیادت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہیں اور سیاسی قیادت کے مدعی اور خواہش مند ہیں اور پھر سیاست بھی اس قسم کی جو کہ یورپین اقوام اور ممالک کی ہے اسلامی سیاست سے نہ واقف ہیں نہ اس کے مدعی۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اصحابِ اغراض تمام لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے امام اور "قائد اعظم" ہیں۔ ان کی امامت اور قیادت پر اجماعِ امت ہو گیا ہے۔"[۴]

اب آیئے مولانا صاحب اور اُن کے ہم مسلک حضرات کی ہوسِ زر کی طرف۔ تحریکِ پاکستان کے مشہور رہنما جناب ایم۔ ایچ اصفہانی صاحب اپنی کتاب "قائد اعظم

---

[۳] ایضاً ص ۲۸، ۲۹۔

[۴] ایضاً ص ۳۵۔

میری نظر میں"، میں مولانا صاحب اور ان کے ساتھیوں کی مسلم لیگ سے علیحدگی کی داستان اس طرح بیان کرتے ہیں:

"آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے لاہور کے جلسہ کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے مجھے تعجب بھی ہوا اور سخت رنج بھی۔ پارلیمنٹری بورڈ کے جلسے کے دوران کئی تقریریں ہوئیں مجھے یاد ہے کہ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولوی حسین احمد صاحب نے مسٹر جناح کی تائید کی اور ان کی اس تحریک پر کہ مسلم لیگ کو زندہ سیاست کے اکھاڑے میں لایا جائے خوشنودی کا اظہار کیا۔ لیکن آخری روز ان دو عالموں میں سے ایک نے یہ تجویز پیش کی کہ چونکہ انتخابات میں ایک جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ کی کامیابی کے لیئے مؤثر اور مسلسل پروپیگنڈہ کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا دیوبند اپنے تمام ذرائع لیگ کی خدمت میں پیش کر دے گا۔ بشرطیکہ پراپیگنڈا کا خرچ لیگ برداشت کرے۔ اندازہ لگایا گیا کہ شروع میں کوئی پچاس ہزار روپے درکار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت لیگ کے صندوقچے میں پچاس تانبے کے سکے بھی نہ تھے۔ صدر اور سیکرٹری جو دونوں اعزازی تھے اپنے دفتر اپنے تھیلوں میں اٹھائے پھرتے تھے مولانا کو مسلم لیگ کی مالی حالت کا علم (ہم میں سے) جو لوگ جلسے میں حاضر تھے ان میں بیشتر کی نسبت زیادہ اچھی طرح تھا اس لیئے وہ اپنی تجویز کے جواب کے متوقع بھی ضرور ہوں گے۔ جو ظاہر ہے کہ کیا دیا جا سکتا تھا۔ مسٹر جناح کو انہیں بتانا پڑا کہ ایسی رقم موجود نہیں تھی اور نہ ہی یہ انہیں اُمید تھی کہ وہ مستقبل قریب میں اتنا روپیہ جمع کر سکیں گے۔ انہوں نے سب سے التجا کی کہ وہ جو بھی ذرائع خود فراہم کر سکیں ان سے کام لیں اور کوئی ٹھوس نتائج پیدا کر کے

دکھائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ ہم سچے دل سے اُن کے لیئے کام کرنا چاہتے ہیں تو روپیہ بلاشبہ ضرور مل جائے گا۔ لیکن پہلے ہم کام کر کے تو دکھائیں۔ جون ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے پاس کوئی روپیہ نہ تھا، لہٰذا مسٹر محمد علی جناح مولانا کی یہ پیش کش منظور نہ کر سکے کہ ،، مالی امداد کی شرط پر وہ دارالعلوم دیوبند کے تمام ذرائع ان کے لیئے وقف کر دیں گے۔،، معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولاناؤں کو اس سے مایوسی ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ ہندو کانگرس کی طرف ڈھلتے گئے اور کانگرس پارٹی کے لیئے پرچار کرنے لگے جو ظاہر ہے کہ ان کے مالی تقاضے پورے کر سکتی تھی ؎ شه

اب ہم آخر میں ایک مشہور احراری لیڈر مولوی عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کا ایک واقعہ بیان کر کے اس داستان کو سمیٹتے ہیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہو گا کہ سبھی نیشنلسٹ علماء چاہے وہ کانگرسی تھے یا احراری ہوسِ زر کے بندے تھے۔ شاہ صاحب کے مخلص عقیدت مند جناب سورش کشمیری صاحب راوی ہیں کہ:۔

،، ایک دفعہ دورانِ تقریر شاہ صاحب سے کسی نے سوال کیا۔ شاہ جی جناح سے آپ کا کیا اختلاف ہے؟

فرمایا۔ کوئی نہیں۔

وہ۔ ایک کیوں نہیں ہو جاتے۔

شاہ جی۔ بھئی میں تو ان کی کفش برداری کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن میرے ذہن میں بعض کانٹے ہیں۔ وہ (قائداعظم) یاد فرمائیں میں سر کے بل جاؤں گا۔ سمجھا

شه ،، قائداعظم میری نظر میں ،، تالیف اصفہانی ترجمہ شاہکار ایڈیشن لاہور ۱۹۶۷ء ص ۱۰۔

دیا تو آرام سے بیٹھیں ان کی لڑائی خود لڑوں گا۔ لیکن وہ ہم سے بات نہیں کرتے صرف بیعت چاہتے ہیں۔ مجمع دیہاتی تھا۔ قائداعظم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

میری گھگھری نوں گھنگرو لوا دے جے توں میری ٹور ویکھنی ے

ظاہر ہے کہ گھگھری کو گھنگرو ٹاٹا اور برلا ہی لگوا سکتے تھے اور انہوں نے لگوائے بھی اس طرح برصغیر میں ایک بار پھر جعفر اور صادق کی داستان زر کے بل بوتے پر دہرائی گئی۔

ے عطاء اللہ شاہ بخاری تالیف شورش کشیری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء ص ۲۸۹

باب ۱۰

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ عامۃ المسلمین میں عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حکیم الامت کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے مسلمان قوم کی جو علمی و سیاسی خدمات سرانجام دی ہیں، وہ ہر قسم کے تعارف سے بے نیاز ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں ان کا صد سالہ جشن ولادت سرکاری طور پر بڑے اعزاز سے منایا گیا ہے۔ ان چند سالوں میں اُن کی سوانح اور افکار و خیالات پر کئی اچھی کتابیں بھی سامنے آئی ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے مخالفین و معترضین بوکھلا گئے ہیں اور انہوں نے اُس عزت و احترام کو جو حضرت علامہ کے لیئے عوام کے دل میں ہے محو کرنے کے لیئے ایک سوچی سمجھی سکیم تحت اپنی اشاعتی صلاحیتیں وقف کر دی ہیں اور ایسا لٹریچر منظر عام پر لایا جا رہا ہے جس میں مولوی حسین احمد کو اسلام کے نابغہ عظیم اور حضرت علامہ کو اسلامی تعلیمات سے قطعاً بے خبر ایک فرنگ زدہ کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ماہنامہ الرشید ساہیوال کا "مدنی و اقبال نمبر" اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے اس کے مکمل تعارف کے لیئے تو ایک دفتر درکار ہے۔ ذیل میں قارئین کرام کے سامنے اس باطل افروز نمبر کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

مولانا حسین احمد نجیب رفیق دار التصنیف دار العلوم کراچی اپنے مضمون "مسئلہ قومیت اور اسلام" میں ایک ذیلی سُرخی "علامہ اقبال کا فہم دین اور مسئلہ قومیت" قائم کر کے لکھتے ہیں :۔

الف "علامہ اقبال کا جو تعارف آج تک کرایا جا رہا ہے۔ اس سے ایک فلسفی شاعر کا سراپا ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ اعزاز اگرچہ اہل دُنیا کی نظر میں کسی بڑی شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اس اعزاز پر

نازاں افراد کے لیئے اس طرح پر ہے کہ اس نے اپنے انتہائی برگزیدہ بندوں اور مقربین یعنی انبیاء علیہم السلام کے لیئے صفتِ شعر سے متصف ہونے کو مذموم قرار دیتے ہوئے اس کی یوں نفی کر دی ہے۔

وماعلمنه الشعر وما ينبغی له ان هو الا ذکر وقران مبين ○

اور شاعر ہونے کے اعزاز کی مذمت کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان فرمایا کہ:۔

والشعرآء يتبعهم الغاؤن ○ الم تر انهم فی کل واد يهيمون ○ وانهم يقولون مالا يفعلون ○ (شعراء ۲۲۴ - ۲۲۶)

ان دو ارشادات کی روشنی میں "علامہ ایک فلسفی شاعر" کا جو مقام و مرتبہ شریعتِ اسلامیہ میں متعین ہوتا ہے وہ ہر ذی عقل پر عیاں ہے۔ اس حقیقت کے آشکارا ہو جانے سے کم از کم یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ کو فلسفی اور شاعر کا اعزاز دے کر بامِ عروج تک پہنچایا دیا جا سکتا ہے۔ مگر قرآن و سنت کے مفاہیم متعین کرنے میں ان کے کسی قول یا نظریے کو بطور استدلال اختیار کرنا قرآن کے مذکورہ بالا ارشاد کا کھلا ہوا مصداق قرار پائے گا ......

علامہ اقبال نے جن اساتذہ سے اعلیٰ دنیاوی علوم کی تحصیل کی ہے وہ نہ صرف غیر مسلم تھے بلکہ ان کی اسلام دشمنی پر تاریخ عالم شہادت بتینہ پیش کرتی ہے پھر ان کے اساتذہ سے علامہ نے جو علوم حاصل کیئے ان کی اصل بنیاد تغیر پذیر مغربی فلسفہ تھا جس میں ایک منزل پر ٹھہراؤ اس کے زوال کا پہلا زینہ بن سکتا تھا۔ ادھر اسلام سے علامہ اقبال کا لگاؤ تحقیقی ہونے کے بجائے زیادہ جذباتی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات و نظریات میں نہ تو ٹھہراؤ

نظر آتا ہے اور نہ گہرائی۔ ایک وقت میں وہ وطنیت و متحدہ قومیت کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں تو دوسرے وقت میں ان ہی کو مذہب کا کفن اور مردود ٹھہرانے لگتے ہیں۔ جی میں آیا تو خدا سے شکوہ شکایت کرنے لگے اور طبیعت کی جولانی ہوئی تو خدا کی زبان بن کر (نعوذ باللہ من ذلک) انسان کے شکووں کا جواب دینے لگے جس مغربی تہذیب کی آغوش میں پروان چڑھے اسی کے جدید الہیات کے فلسفے کو اپنایا اور پھر اسی پر تنقید کرنے بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس مردود مغربی تہذیب کی آغوش میں نہ صرف اپنی اولاد کو سُلا دیا بلکہ برصغیر کے اسی گروہ کی ہمدردیاں ان کو حاصل ہوئیں جو مغربی تہذیب میں سرتاپا غرق ہو چکا تھا"[1]

ب "دینی علوم کے بارے میں سطحی معلومات بھی علامہ اقبال کے فکر و عمل کا ایک بنیادی مسئلہ ہے قرآن و سنت کی زبان اور اس کے علوم سے براہِ راست عدم واقفیت اس کا بڑا سبب ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال عربی لغت کے لفظ ملت اور قوم میں کوئی فرق نہیں کرتے علامہ کے کلام اور دوسرے خطوط و مضامین سے یہی ثابت ہوتا ہے حالانکہ قرآن و سنت میں دونوں کا مفہوم جدا جدا بیان کیا گیا ہے اور پھر علامہ کا نظریۂ ملت بھی تو قرآن و سنت اور لغتِ عرب سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ علامہ کے نزدیک "قوم و ملت اور امت" وغیرہ الفاظ مترادف معنی میں استعمال ہوتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے"[2]

---

[1] ماہنامہ "الرشید" ساہیوال، "مدنی و اقبال نمبر" ستمبر ۱۹۷۸ء ص ۳۱۱، ۳۱۲۔
[2] ایضاً ص ۳۱۲۔

۲۔ پورے نمبر میں مولانا حسین احمد کے نام ساتھ تعظیمی الفاظ '' رحمۃ اللہ علیہ '' لکھے ہوئے موجود ہیں لیکن حضرت علامہ کے نام کے ساتھ کہیں بھی رحمۃ اللہ علیہ یا اس کا مخفف '' رح '' درج نہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد کا حلقہ حضرت علامہ کو اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ یا اس قسم کا کوئی امتیازی لفظ یا لقب استعمال کیا جائے۔ مثال کے طور پر صرف ٹائٹل ہی ملاحظہ فرمائیں۔

ٹائٹل پر '' مدنی و اقبال نمبر '' لکھا ہوا ہے۔ مدنی پر '' رح '' کا نشان موجود ہے لیکن حضرت علامہ کے نام پر نہیں۔ محض اسی ایک چیز سے نمبر کے مرتبین کے وہ ناپاک عزائم و مقاصد صاف طور پر نظر آ رہے ہیں جو ان کے بغض سے بھرے ہوئے سینوں میں چھپے ہوئے ہیں۔

۳۔ ۱۹۳۸ء کے دور میں حلقۂ دیوبند کے شاعروں اور ادیبوں کی طرف سے حضرت علامہ کے خلاف جو نظمیں لکھی گئی تھیں ان میں سے چیدہ چیدہ نظموں کو بڑے اہتمام اور جلی کتابت سے شامل نمبر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں صفحات ۲۲۵، اور ۲۲۸۔ ان نظموں کا متن ہم ایک کسی باب میں نقل کر چکے ہیں۔

۴۔ ہم اس نمبر کے ایک مضمون نگار مولانا عزیز الحسن صدیقی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کھلے دل سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ جمعیت العلماء کا کوئی سیاسی اصول نہیں انہیں نہ تو کسی سیاسی پارٹی سے چاہے وہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہی کیوں نہ ہو مخالفت ہے اور نہ ہی کسی پارٹی سے ہم آہنگی ہے چاہے وہ کانگرس ہو اسے تو صرف اپنے مفاد سے غرض ہے۔ جس پارٹی سے بھی یہ مفاد حاصل ہو سکتا ہو۔ وہ بے دھڑک اس کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لینے میں تامل محسوس نہیں کرتی۔ مولانا عزیز الحسن اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

'' یہ بات سب کو معلوم ہوتی ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند ۱۹۴۷ء سے قبل

پارلیمنٹ سیاست میں کھل کر حصہ لیا کرتی تھی۔ مگر حصول آزادی کے بعد جب حکومت نے سیکولر حکومت کو بنانے اور اسی کے مطابق نظام حکومت کی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی وقت جمعیۃ العلماء ہند نے جماعتی حیثیت سے پارلیمانی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مگر مسلمانوں کی نمائندگی کا ایک بہترین فارمولا یہ اختیار کیا کہ اپنے آزمودہ کار افراد کو مرکزی و صوبائی حکومت کے ایوان نمائندگان میں سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے بھیجتی رہی۔ کوئی کانگرس کا ممبر ہوتا، کوئی سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کا۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ طریقہ اب بھی اس نے اختیار کیا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں اجلاس گیا میں مولانا سید حمید الدین نے ایک بلیغ جملہ میں اس پالیسی پر کیا اچھا تبصرہ کیا تھا انہوں نے کہا تھا '' جمعیۃ علماء ہند کی سب سے بڑی سیاست یہ ہے کہ وہ سیاست میں نہیں ہے۔ ''[۵۳]

حقیقت بھی یہی ہے جو سید حمید الدین صاحب نے بیان کی ہے کہ جمعیت علماء کا کوئی سیاسی اصول نہیں۔ تقسیم سے پہلے اور بعد میں بھی اسے '' زر '' کی طلب تھی جو اس کی پوری ہو رہی ہے۔

۵۔ Anti iqbal کے سلسلہ کی ایک اور کتاب '' اقبال کے ممدوح علماء '' بھی ۱۹۷۷ء میں جلوہ افروز ہوئی ہے۔ کتاب کے مصنف ہیں قاضی افضل حق قریشی صاحب۔ قریشی صاحب کا یہ کاغذی پھول بھی بے شمار گمراہی اور جھوٹ کی رنگینیاں اپنے اندر لیے ہوئے ہے صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔

سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے قریشی صاحب

---

۵۳ '' مدنی و اقبال نمبر '' مضمون سید اسعد مدنی ص ۲۰

فرماتے ہیں۔

"علامہ اقبال مرحوم نے یہ نظم ۱۹۲۱ء میں لکھی تھی جب تحریک خلافت شباب پر تھی اور شاہ صاحب تین سال کے لیئے زندان فرنگ میں اسیر و محبوس کر دیئے گئے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند

قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے

مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر،

کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست

ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

بحوالہ "شاہ جی" مرتبہ نذیر مجیدی مطبوعہ لاہور ص ۲۹۶

سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرتبہ خان کابلی مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۰ء ۵۴

تاریخ کا معمولی سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ اشعار سید عطاء اللہ بخاری کی تعریف میں نہیں کہے گئے۔ بلکہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت کی توصیف و مدح میں ہیں۔ جب وہ جیل سے رہا ہو کر مسلم لیگ، کانگرس اور خلافت کے متحدہ جلسہ میں شریک ہوئے، یہ

---

۵۴ اقبال کے ممدوح علماء، تالیف قاضی افضل حق قریشی مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۷۷ء ص ۱۴۱۔

حقیقت اتنی زیادہ کتابوں اور رسائل و اخبارات میں محفوظ ہے کہ میں حیران ہوں کہ کس کتاب یا اخبار کا حوالہ دوں۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ اتنا بڑا جھوٹ اور اتنے دھڑلے سے بولا جا رہا ہے۔ صرف تین کتابوں کے نام تو ابھی قارئین کی نظروں سے گزرے ہیں۔ جن میں یہ اشعار عطاء اللہ شاہ صاحب کی تعریف کے سلسلے میں درج کیئے گئے ہیں۔ کیا یہ اقبال کے شیدائیوں کی بے حسی نہیں کہ وہ ایسی غلط چیزوں کا نوٹس تک نہیں لیتے۔ خیر یہ چند باتیں تو بطور جملہ معترضہ آگئیں۔ اب صرف ایک ثبوت ملاحظہ ہو کہ یہ اشعار مولانا بخاری کی تعریف میں نہیں کہے گئے جو اس وقت ایک عام آدمی تھے "رستم داستان" تو انہیں بعد میں یاروں نے بنایا۔ بلکہ مولانا محمد علی و شوکت علی کی تعریف میں ہیں جو نیشنلسٹوں کی آنکھوں میں اسی طرح کھٹکتے ہیں جس طرح حضرت علامہ اور حضرت قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہم۔

حکیم محمد حسن قریشی صاحب اپنے ایک مضمون "اقبال اور محمد علی" میں لکھتے ہیں۔

"امرتسر میں کانگرس، مسلم لیگ اور خلافت کے جلسے ہوئے۔ محمد علی، اپنے بھائی شوکت علی کے ساتھ ۵ سال کی قید و بند کے مصائب برداشت کرنے کے بعد امرتسر آئے۔ جہاں دونوں بھائیوں کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ کانگرس کے اجلاس میں شرکت کے بعد علی برادران مسلم لیگ کے پنڈال میں گئے۔ جس میں ہندوستان کے تمام اکابر شریک تھے۔ علامہ اقبالؒ بھی نواب ذوالفقار علی خاں اور مرزا جلال الدین کی رفاقت میں اس جلسے میں شریک ہونے کے لیئے لاہور سے تشریف لے گئے تھے۔ علامہ اقبال سٹیج پر مولانا محمد علی سے بغل گیر ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے علی برادران کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار ارشاد فرمائے۔ ۵۵

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند

قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

---

۵۵ اقبال نمبر روزنامہ امروز لاہور ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

مولانا عبدالمجید سالک فرماتے ہیں :-

"دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے مقام پر کانگرس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس قرار پائے۔ اس موقع پر گاندھی، تلک، مسز بیسنٹ موتی لال نہرو اور دوسرے بڑے بڑے رہنما کانگرس میں شریک ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے صدارت کی۔ مسلم لیگ کا اجلاس منڈوہ کنہیا لال میں ہوا۔ حکیم اجمل خاں نے صدارت فرمائی۔ اسی موقع پر مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی بھی بیتول جیل سے رہا ہو کر آ پہنچے۔ علامہ اقبال اور مرزا جلال الدین نواب ذوالفقار علی خاں کی موٹر کار میں لاہور سے چلے کہ امرتسر کے ہنگاموں کو دیکھ آئیں۔ وہاں پہنچ کر جب مسلم لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علامہ اقبال علی برادران کے ساتھ بغل گیر ہوئے، تو جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا۔ اکثر لوگ اشکبار تھے۔ علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعار آبدار فرمائے۔ جو اسی دن موٹر کے سفر میں موزوں ہو گئے تھے۔ [۵۵]

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند

قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند   اکا [۵۵]

مندرجہ بالا دونوں حوالوں کے بعد میں قاضی افضل حق سے سوائے اس کے کیا عرض کروں۔

ع   جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز ہے

کہاں بخاری اور کہاں جوہر ——— چہ نسبت خاک را با عالم پاک

---

[۵۵] ذکر اقبال تالیف عبدالمجید سالک مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء ص ۱۰۵، ۲۲۔

باب ۱۱

اقبال کا آخری معرکہ

مشاہیر، اخبارات اور رسائل کی نظر میں

"اقبال کا آخری معرکہ"

کا پہلا ایڈیشن جسٹس جاوید اقبال کی نظر میں

(۱) لاہور

مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۷۹ء

جناب سید نور محمد صاحب

سلام مسنون

—— آپ کی ارسال کردہ کتاب "اقبال کا آخری معرکہ" موصول ہو گئی بہت بہت شکریہ۔ میں نے اسے دیکھا ہے نہایت محنت سے تحریر کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کے پیروکار جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو ان کا انداز مناظرانہ ہوتا ہے محققانہ نہیں ہوتا۔ حضرت علامہ کی طرف سے تو مولانا کے ساتھ کوئی مناظرہ کرنا مقصود نہ تھا ایک حقیقت کا انکشاف کرنا تھا اور وہ کر دیا گیا۔

والسلام

خیر اندیش

جاوید اقبال

(۲) ——— ماہنامہ طلوع اسلام

(۳) ——— ماہنامہ "محفل"

(۴) ——— ماہنامہ فیض الاسلام

اقبال کا آخری معرکہ تالیف سید نور محمد قادری

تبصرہ نگار ——— عرشی امرتسری

کتاب کی تقریب میں "فیض الاسلام" کے اقبال نمبر میں شائع شدہ بعض مضامین پر تنقید کی گئی ہے اور "الرشید" کے مدنی و اقبال کے مندرجات کے غیر شائستہ لہجے کو خصوصاً ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد محترم مؤلف نے مدنی و اقبال کے اختلاف کا پس منظر رقم فرمایا ہے جو ایک اہم دستاویز ہے۔ دوسرے باب میں حضرت مدنی کے نظریہ "ملت از وطن است" پر اقبال کی تاریخی تنقید اور اس پر علمائے دیوبند کے اعتراضات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جناب مؤلف کی نظر و مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے کوئی بات مستند حوالہ کے بغیر نہیں لکھی۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیئے یہ کتاب نہایت دلچسپ اور معلومات کا ذخیرہ ہے۔

(ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی جون ۱۹۷۹ء صـ ۴۲)

(۵) ——— ماہنامہ "فیضان" لاہور

(۶) ——— ہفت روزہ "رضا کار" لاہور

"مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے آل انڈیا کانگرس کے ایما پر ایک نظریہ پیش کیا "ملت از وطن است"، جب اس نظریہ کو مسلمانوں میں پذیرائی کے لیئے پیش کیا تو علامہ اقبال نے اس کی مخالفت کی اور

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ ‏ ‏ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ‏ ‏ چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ‏ ‏ اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

دیوبندی علماء اور ان کے معتقدین اور احباب نے علامہ کے خلاف بہت کچھ لکھا لیکن بحث طلب امور علامہ مذکور کے مذکورہ اشعار کی روشنی میں آج تک اپنی حقانیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ علامہ نے ان کی تشریح بھی کی ہے کہ جسے قوم کہتے ہیں۔ اس سے مراد ہے کسی طرح کی گروہ بندی کانگرس کے نزدیک تو اس کی اساس وطن ہے جس کے پیش نظر وہ اس ملک کے بسنے والوں کو ایک قوم سمجھتی ہے۔

آج بھی کچھ لوگ غلط تاویلوں سے اقبال مرحوم کے مذکورہ اشعار میں قسم قسم کی مین میخ نکال رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ علامہ اقبال نے مولانا مدنی کے نظریہ کو غلط سمجھا چنانچہ "الرشید" کے تازہ شمارے "مدنی و اقبال نمبر" اور "فیض الاسلام" راولپنڈی کے اقبال نمبر میں اعجاز الحسن قدوسی نے "اقبال اور علمائے پاک و ہند" میں حسین احمد مدنی کی موافقت میں اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن حقیقت آج بھی وہی ہے۔ جو علامہ مرحوم کے زمانہ میں تھی۔

"اقبال اور آخری معرکہ" ایک تحقیقی دستاویز ہے جس میں تحریک پاکستان اور نیشلسٹ علماء کے کردار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ موافق اور مخالف دونوں قسم کے نظریات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک محقق کو ضرورت پڑتی ہے۔ قاری صاحب نے اپنے موقف کو بڑی کوشش اور دقیق النظری سے پیش کیا ہے

سے

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہو گی وہ دیا رہ جائے گا

(ہفت روزہ "رضاکار" ۲۴ اگست ۱۹۶۹ء ص۳)

باب ۱۲

کتابیات

کتابیات

اقبال، علامہ سر محمد

تمام مجموعہ ہائے کلام فارسی و اردو

مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان ۱۹۵۴ء لاہور

اللہ بخش یوسفی

سرحد کی جدوجہد آزادی ۱۹۶۸ء لاہور

احمد رضا خاں بریلوی

المحجۃ المؤتمنۃ ۱۹۲۰ء بریلی

اصفہانی، ایم ایچ

قائداعظم میری نظر میں ۱۹۷۶ء شاہکار ایڈیشن لاہور

حبیب احمد چوہدری

تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ۱۹۶۶ء لاہور

حسین احمد دیوبندی

مکتوبات شیخ اسلام جلد اول دیوبند

مکتوبات شیخ اسلام جلد دوم ۱۹۶۶ء دیوبند

متحدہ قومیت اور اسلام ۱۹۷۵ء لاہور

متحدہ قومیت اور اسلام دہلی

مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل سنہ ۱۳۶۵ھ دہلی

خورشید ڈاکٹر عبدالسلام

سرگزشتِ اقبال سنہ ۱۹۷۷ء لاہور

راز (غلام احمد پرویز کا قلمی نام)

متحدہ قومیت اور اسلام سنہ ۱۹۷۸ء لاہور

رضیہ، فرحت بانو

خطباتِ اقبال سنہ ۱۹۴۲ء دہلی

عبدالشکور، پروفیسر

حسرت موہانی سنہ ۱۹۴۶ء آگرہ

عبدالعزیز بی۔ ایس سی

محمد علی جناح سنہ ۱۹۳۹ء بمبئی

عبدالوحید خاں

تاثرات و تصورات سنہ ۱۹۶۰ء لاہور

فقیر سید وحیدالدین

روزگارِ فقیر جلد دوم سنہ ۱۹۶۴ء کراچی

قریشی، احمد حسین احمد

من کیستم سنہ ۱۹۶۲ء کراچی

شورش، عبدالکریم

عطاء اللہ شاہ بخاری سنہ ۱۹۶۳ء لاہور

مودودی، سید ابوالاعلیٰ

مسلمان اور سیاسی کش مکش حصہ اول سنہ ۱۹۴۲ء لاہور

مسلمان اور سیاسی کش مکش حصہ دوم سنہ ۱۹۴۲ء لاہور

مسئلہ قومیت سنہ ۱۹۳۹ء لاہور

محمد رفیق افضل

گفتارِ اقبال سنہ ۱۹۶۹ء لاہور

محمد رضا انصاری

محمد رسول اللہ (ترجمہ) تاج کمپنی کراچی

مولانا، سید سلیمان اشرف

النور سنہ ۱۹۲۱ء علی گڑھ

نیازی، سید نذیر

اقبال کے حضور سنہ ۱۹۷۱ء کراچی

یامین نواب سر محمد

اعمال نامہ جلد اول سنہ ۱۹۷۰ء لاہور

رسائل

"جامعہ" جولائی سنہ ۱۹۳۶ء دہلی

"حقیقتِ اسلام" ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء لاہور

"ادبی دنیا" اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء لاہور

"نئی زندگی" جولائی سنہ ۱۹۳۸ء دہلی

"اقبال" اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء لاہور

"فیضِ اسلام" سنہ ۱۹۷۷ء راولپنڈی

اہلِ علم کیلئے ضیاء القرآن پبلی کیشنز (وقف) کی ایک اور عظیم علمی پیشکش

قرآن حکیم ہی نظریاتی خلفشار کے موجودہ تاریک دور میں بنی نوع انسان کو ایک باوقار مستقبل کی راہ دکھاتا ہے

قرآنی علوم کا بیش بہا خزینہ

تفسیر الحسنات

مؤلفہ

مفسرِ قرآن علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

کلام مجید کو سمجھنے میں تفسیر الحسنات آپ کی صحیح راہنمائی کریگی

یہ تفسیر چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے

ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور